کنڑا اور اُردو کے

گیان پیٹھ انعام یافتہ
اہلِ قلم

مرتب

پروفیسر محمد صبغۃ اللہ

ناشر

کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور

کنڑا اور اُردو

کے

گیان پیٹھ انعام یافتہ

اہل قلم

مرتب

پروفیسر محمد صبغۃ اللہ

ناشر

کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور

© کرناٹک اُردو اکادمی، بنگلور

کتاب کا نام : کنڑ اور اُردو کے گیان پیٹھ انعام یافتہ اہل قلم

مرتب و مترجم : پروفیسر محمد صبغۃ اللہ

تعداد : 1000

سالِ اشاعت : 2001ء

قیمت : -/80 روپے

صفحات : 80

مطبع : SPAN PRINT بنگلور

کمپیوٹرائز : محمد متین الدین ندوی

ناشر : حمید اے صفی

رجسٹرار

کرناٹک اردو اکادمی، نمبر 14/3

کینارا فائنانس کارپوریشن کامپلکس

ترچنگا روڈ، بنگلور۔ 560 001

فہرست

کنڑ اور اردو کے چند اہل قلم	پروفیسر عبدالغفار شکیل	4
عرض مرتب	پروفیسر محمد صبغۃ اللہ	5
کوئمپو	کے یم منی کرشنپا	7
ڈ. را. بیندرے	ڈاکٹر ڈی منگل پریہ درشنی	18
ماستی وینکٹیش آئینگار	رام لکشمی نارائن	27
ونایک کرشنا گوکاک	ملے پورم جی وینکٹیش	32
شیورام کارنت	محکمۂ اطلاعات و نشریات، حکومت کرناٹک	37
یو آر اننت مورتی	محکمۂ اطلاعات و نشریات، حکومت کرناٹک	41
گریش کارناڈ	ڈاکٹر سہاکانت جوشی	43
رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	پروفیسر محمد صبغۃ اللہ	51
قرۃ العین حیدر	پروفیسر محمد صبغۃ اللہ	57
علی سردار جعفری	پروفیسر محمد صبغۃ اللہ	59

کنڑا اور اردو کے چند گیان پیٹھ انعام یافتہ اہل قلم

حکومت ہند کی طرف سے ہندوستانی زبانوں کے بہترین ادب کے تخلیق کاروں کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے جو ہندوستانی اہل قلم، ادیبوں، شاعروں کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔ اب تک ہندی اردو کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں کے کئی عظیم اہل قلم کو حکومت ہند نے اس عظیم ایوارڈ سے نوازا ہے۔ کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور کی جانب سے گیان پیٹھ ایوارڈ پانے والے (کنڑا کے سات کوویمپو، د۔ را۔ بیندرے، ماستی وینکٹیش آئینگر، وی۔ کے۔ گوکاک، شیورام کارنت، یو۔ آر۔ اننت مورتی، گریش کارناڈ۔ اردو کے تین رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، قرۃ العین حیدر اور علی سردار جعفری) اہل قلم کے بارے میں ایک مختصر تعارفی کتاب شائع کی جارہی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد کرناٹک کے اردو داں طبقے کو عموماً اور کرناٹک میں اردو کے ادباء و شعراء اور دیگر اہل قلم حضرات اور نئی نسل کے نوجوانوں کو خصوصاً گیان پیٹھ انعام یافتگان کے نام اور کام سے روشناس کرانا ہے اور انہیں احساس دلانا ہے کہ وہ اپنے ادبی ذوق کی آبیاری کے لئے ان انعام یافتہ گان سے رہنمائی اور روشنی حاصل کریں اور خود اپنے اندر بھی ایسی صلاحیتیں پیدا کریں جو انہیں تحریک دلائیں کہ ایسی تخلیقات پیش کریں جو ایک دن انہیں بھی ملک کے اس عظیم انعام و اعزاز کا مستحق بنیں۔ میرے دوست پروفیسر محمد صبغۃ اللہ نے کرناٹک کے اردو احباب کے لئے یہ مختصر سی تالیف تیار کی ہے۔ جسے کرناٹک اردو اکادمی اُردو عوام کے سامنے پیش کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ میں بھی اور اکادمی کے رجسٹرار حمید اے صفی صاحب اس میں شامل ہیں۔

امید ہے کہ ادبی حلقوں میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

پروفیسر عبدالغفار شکیل

چیرمین کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور

عرض مرتب

کنڑا کرناٹک کی عام زبان ہی نہیں بلکہ سرکاری اور دفتری زبان بھی ہے اور اس کا ادب بڑا وقیع ہے۔ یہ وقت کا تقاضا ہے کہ قارئین اردو اس زبان و ادب سے مستفید ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ قدیم زبانوں میں سے ایک اہم زبان ہے جس کے متعلق یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کم از کم دو ہزار سال قبل سے کنڑا کا وجود تھا۔ کنڑا میں تحریر پہلی صدی عیسوی یا اس سے قبل شروع ہوئی لیکن پانچویں صدی عیسوی سے اس کے استعمال کا ثبوت ملتا ہے۔ شہنشاہ اشوک کے زمانے ہی سے سنسکرت یا پراکرت کے کتبے اور فرمان کنڑا میں ملتے ہیں۔ کنڑا کا اولین کتبہ بال بڈی میں پایا گیا جس کی تاریخ ۵۰۰ء مسلم ہے۔ ظاہر ہے کہ پانچویں صدی سے قبل ہی اس نے شائستہ زبان کی حیثیت حاصل کرلی تھی اور سنسکرت سے متاثر تھی کنڑا کی پہلی کتاب "کوی راج مارگا" ۹۰۰ء میں لکھی گئی۔ مختصر طور پر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ کنڑا دو ہزار سال سے ایک زبان کی حیثیت سے استعمال میں رہی ہے۔ مختلف مدارج سے گزری اور بڑھتے بڑھتے ایک مکمل زبان کے درجے کو پہنچی اس میں ڈیڑھ ہزار سال قدیم ایک وسیع اور متنوع ادب موجود ہے، جو مواد موجود ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کنڑا ادب بھی ایک ہزار سال قدیم ہے۔ یہ زبان تامل، تیلگو اور ملیالم کے ساتھ دراوڑی زبانوں کے خاندان سے متعلق ہے۔ کرناٹک کو کروناڈو کی سنسکرت شکل کہا گیا ہے یعنی کالی مٹی والی زمین یا کمت ناڈو جس کے معنی ہیں پھولوں اور صندل کی خوشبو والی سرزمین۔ کروناڈو یعنی اونچی یا بڑی سرزمین۔ مرور زمانہ کے ساتھ کرناڈو سے کنڈاو اور آخر کار کنڑا بن گیا جس کے معنی اس زبان اور اس کے بولنے والوں کی سرزمین ہے۔ آگے چل کر کنڑا کنار اور آخر کار مغرب والوں کی بولی میں کنارلیس بن گیا غالباً پرتگالیوں کے میل جول سے ایسا ہوا۔

ہندوستان میں ادب کے فروغ کے لئے کئی ادارے بنے ہیں علاقائی سطح پر بھی اور قومی سطح پر بھی۔ لیکن قومی سطح پر ہر سال ادب کے لئے ایک بہت بڑا ایوارڈ مقرر کیا گیا ہے جو سال کے بہترین

ادب کی کتاب پر اور ادب کی مجموعی خدمات پر کسی ایک شخص کو دیا جاتا ہے۔ وہ ہے گیان پیٹھ ایوارڈ۔ 'گیان، مطلب 'علم'؛ 'پیٹھ' مطلب، 'مرکز' 'ایوارڈ' 'انعام' کے مطلب میں ہے۔ یعنی مرکز علم کا انعام جو ایک کانسے کی مورتی، تانبے کی سند اور پانچ لاکھ روپے نقد کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ کنڑا اور اُردو ادب کے فنکاروں کو اب تک کئی ایسے انعامات حاصل ہوئے ہیں۔ ہم یہاں ان کا مختصر تعارف کرانے کی کوشش کریں گے۔

پروفیسر محمد صبغۃ اللہ

ڈاکٹر کوئمپو

ಡಾ ॥ ಕುವೆಂಪು

۲۹؍دسمبر ۱۹۰۴ء تا ۱۰؍نومبر ۱۹۹۴ء

کنڑا زبان کے مشہور شاعر کے وی پٹپّا تخلص کوئمپو (کنڑا میں تخلص یا قلمی نام رکھنے کا بھی ایک نرالا طریقہ ہے۔ جیسے کوئمپو گاؤں کا نام کا ابتدائی حرف کُ کیلئے والد کے نام کا ابتدائی حرف وِیم وینکٹپا کے لئے اور اپنے نام کا پہلا حرف پُ پٹپّا کے لئے۔ ۲۹؍دسمبر ۱۹۰۴ء ان کی پیدائش اپنے ننھیال ہیرے کوڈگو (ضلع چکمگلور) میں ہوئی۔ ددھیال کُپلّی میں پرورش پائی۔ والدین وینکٹپا گوڈا اور سیتما تھے۔ اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ عہد طفولیت طے کرتے ہوئے ملناڈ کے حسین مناظر سے تاثر بھی حاصل کرتے رہے۔ ابتدائی تعلیم تیرتھ ہلّی میں (ضلع شیموگہ) میں حاصل کی۔ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ۱۹۱۸ء میں میسور آئے ویسلین مشن ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ طالب علمی کے دوران ذوقِ شاعری جلاپائی پہلے پہل انگریزی زبان وادب سے مرعوب ومتاثر ہو کر انگریزی میں اپنی شاعری شروع کی۔ ۱۹۲۲ء میں اپنی انگریزی

نظموں کا مجموعہ Biginners Mouse شائع کیا۔ ۱۹۲۴ء میں 'املناکھتے' شائع ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں شری رام کرشنا آشرم آگئے۔ ۱۹۲۷ء میں بی اے ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں طلباء کا مشاعرہ منعقدہ بنگلور کی صدارت کی۔ ۱۹۲۹ء میں یم اے کی ڈگری حاصل کی اور جامعہ میسور میں کنڑا لکچرر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۳۰ء میں کنڑا نظموں کا مجموعہ 'کولل' شائع کیا۔ ۱۹۳۳ء میں ۱۹ویں کنڑا ادبی کانفرنس کے مشاعرہ کی (منعقدہ ہبلی) کی صدارت کی۔ ۱۹۳۷ء میں ہیماوتی سے شادی کی۔ پورن چندر تیجسوی ان کی اولاد نرینہ ہے۔ ۱۹۳۹ء میں کوئمپو کا تقرر بحیثیت ریڈر سنٹرل کالج بنگلور میں ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں مہاراجہ کالج میسور کے پرنسپل کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ اسی سال ان کی تصنیف رزمیہ 'رامائن درشنم' کو مرکزی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ ۱۹۵۶ء میں جامعہ میسور نے انہیں اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔ اسی سال وہ جامعہ میسور کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں ۳۹ ویں کنڑا ادبی کانفرنس منعقدہ دھارواڑ کی صدارت کی۔ ۱۹۵۸ء میں صدر ہند نے پدما بھوشن عطا کیا۔ ۱۹۶۰ء میں مانسا گنگوتری میں تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی سال وہ وائس چانسلر کے عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں ریاستی حکومت نے انہیں راشٹر کوی کا خطاب دیا۔ ۱۹۶۸ء میں کوئمپو ابھینندنا گرنتھا گنگوتری کی اشاعت عمل میں آئی۔ شری رامائن درشنم کو گنان پیٹھ ایوارڈ ملا۔ کنڑا زبان کو ملنے والا یہ پہلا گنان پیٹھ ایوارڈ ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی خدمات کے اعتراف میں جامعہ بنگلور نے انہیں اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۸۸ء میں ریاستی حکومت نے پمپا انعام ۱۹۹۲ء میں کنڑا رتنا کا خطاب دیا۔

۱۰ر نومبر ۱۹۹۴ء میں وفات پائی۔

شاعری

۱۹۱۸ء میں شعر و شاعری کا ذوق شروع ہوا اور انہوں نے انگریزی میں نظمیں لکھنی شروع کی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ جیمس کزنس ایک آئرش شاعر میسور آئے ہوئے تھے۔ پٹپا اپنی انگریزی نظموں کا مجموعہ انہیں دکھا کر ان سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے تھے اسی خیال سے ان کا پیچھا کرتے ہوئے ان تک پہنچے اور اپنی نظموں کا مجموعہ دکھایا۔ کزنس نے ان کی نظموں کو غور سے پڑھا ان کو سر تا پا دیکھا۔ پٹپا گاندھی جی کی سودیشی تحریک میں اپنے آپ کو ملوث کر چکے تھے اسی لئے انہوں نے کھادی پہن رکھی تھی۔ حلیہ کو دیکھ کر کزنس نے کہا کہ تم تو پورے سودیشی ہو لیکن تمہاری یہ نظمیں ودیشی کیوں ہیں۔ اگر تمہاری اپنی نظمیں ہوں تو بتاؤ، نوجوان کو بھی اپنے کام اور اس کی اہمیت پر بھروسہ تھا اور وہ بحث پر اتر آیا اور کہا کہ انگریزی زبان میں جو الفاظ کا ذخیرہ ہے اور شاعر کے خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے جو صلاحیت انگریزی زبان میں موجود ہے وہ کنڑا زبان میں کہاں؟ تب کزنس نے زبان اور اس کے استعمال اور فوائد اور اس سے اپنی زبان کو پہچاننے والے فوائد کے طریقوں کو سمجھایا اور کہا کہ تو اپنی زبان میں اپنے خیالات پیش کرے تو بہتر ہے یہ صلاح دی لیکن یہ اس وقت پسند نہیں آئی۔ لیکن یہ واقعہ اس نوجوان پر اثر پذیر ہوا اور بہت دیر تک اس پر غور و خوص کرنے کے بعد یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی زبان کنڑا میں اپنی تخلیقات کو پیش کریں گے۔ انہوں نے آگے چل کر اپنی شاعری کو دیش میں ادب کو دیا جانے والا سب سے اعلیٰ انعام گیان پیٹھ ایوارڈ دلایا اس وقت کا وہ نوجوان کوئی اور نہیں آج کا کوئمپو ہے اس دن کزنس کو جو نظموں کا مجموعہ دکھایا گیا تھا اس کا نام تھا 'Beginners Mouse' کوئمپو کنڑا کے صف اول کے ایک نہایت ہی قد آور شاعر تھے ان کے یہاں کلاسیکی اور غنائی دونوں کے امتزاج سے بڑی قیمتی

اور زرخیز شاعری وجود میں آئی۔ آپ نے قدیم اور جدید ہندوستان کے عظیم رشیوں اور ممتاز انگریزی اور ہندوستانی شاعروں سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے ماضی کی کتنرا شاعری کا جوہر لیا اور اپنے فکر و نظر اور ذخیرۂ الفاظ میں بیش بہا اضافہ کر لیا۔ ان کی غنائیہ شاعری کے تقریباً بیس مجموعوں میں ہمیں متعدد اور مختلف موضوعات ملتے ہیں لیکن آپ کے تخلیقی عالم پر فطرت اپنی تمام کیفیتوں کے ساتھ چھائی ہوئی ہے۔ فطرت کی محبت اور خدا کی محبت دو جذبات ہیں جن کا رنگ آپ کی شاعری میں غالب ہے۔ بعض اوقات ان میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا اور دونوں ایک دوسرے میں آمیز ہو جاتے ہیں۔ کوئمپو کی شاعری ان کی قوت متخیلہ مشاہدے کی گہرائی اور اسلوب کی سلاست کی بدولت تخلیق سے مالا مال ہے۔ ان کی بہترین نظموں نے جدید شاعری کو ایک بے نظیر دل آویزی عطا کی۔ فطرت پر نظموں کا جہاں تک تعلق ہے ان کو سب پر برتری حاصل ہے لیکن متانت کی کمی اور مناسبت کی احتیاج نے بعض مقامات پر ان کی شاعری کی شان و شوکت اور حسن و جمال کو بگاڑ دیا۔ کوئمپو کی طباعی کی سب سے بڑی کامیابی ان کے رزمیہ 'شری راماین درشنم' میں نمایاں ہے جس میں انہوں نے والمیکی کی راماین کی ترجمانی اپنے مشاہدۂ حیات کی روشنی میں کی ہے۔ اس رزمیہ کی ضخامت چار جلدوں تئیس ہزار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ حیرت انگیز کارنامہ ہے اس سے اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ غنائیہ شاعری کے دور میں جو اس عہد کی خصوصیت ہے۔ رزمیہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایک شاعر پر کوئی موضوع یا صنف ٹھونسی نہیں جا سکتی اور وہ اپنے مشاہدے کی آزادی کا حقدار ہے اور جو راہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اس میں تین چیزیں ملیں گی جو لوگ قصہ کہانی کے شائق ہیں انہیں قصہ ملے گا۔ جو شاعری کے دلدادہ ہیں انہیں شاعری کا لطف ملے گا۔ اور جو لوگ واقعی رام کا درشن چاہتے ہیں ان کو درشن بھی ملے گا۔

مختصر افسانے

کوئمپو نے دو افسانوی مجموعے شائع کئے ہیں پہلا سنیاسی و دیگر کہانیاں اور دوسرا (نن دیور) میرا خدا و دیگر کہانیاں ان میں کل سترہ کہانیاں جمع کی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں جیو تشی، جیوتسیہ، بھوتوں کی تکلیف کا مرکزی رول دکھائی دیتا ہے۔ جس سماج میں ذات پات، اونچ نیچ کا نظام ناخواندگی اور جہالت جہاں اپنا گھر بنائے رکھتی ہے وہاں ان تینوں کی تکلیف کا بھی سہنا لازمی ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ان کے عبادات کی اہمیت اور ان کے فلسفوں کو بڑے سلیقہ سے نبھاتے ہیں ان میں آنے والے بیشتر کردار بد اخلاق دھرم ادھرم ظلم کے درمیان خوب تکلیف سہہ کر آخر کار دھرم کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ ینا کشی نے میشٹر و ایک جذباتی کہانی ہے۔ ینا کشی کو ٹیوشن دینے والا ماسٹر اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ اس سے پیار کر رہی ہے اور وہ اس کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس کو کسی اور کے ساتھ بیاہنے کی بات سن کر غصہ میں آجاتا ہے۔ اس نوشاہ کو قتل کرنے کے ارادے سے لایا جانے والا چاقو ینا کشی کے دفاع کے لئے عطا کرنے کا موقع بنتا ہے۔ ہیرو کا صحتمند ضمیر اور افسانہ نگار کی اخلاقی ہوشمندی ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔

بھوت کی مصیبت

افسانہ اسم با مسمی ہے ایک بھوت کی حقیقت کو ظاہر کرنے والی یہ کہانی ہے۔ آقا کی غیر حاضری میں آپ خود آقا بننے والا نوکر منتا بھجمان نولور کو آنے کی خبر سنتے ہی بھوت کے خوف کی افواہیں پھیلا کر خود اس کا مرکزی کردار بن کر کام کرتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے طنز بھرے مکالموں سے اس معاملہ پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ یہاں کے "اپنی بڑائی چھانٹنے والے پجاری کو چند لوگوں نے

گالیاں دی، کچھ اس پر ہنسے بھی کچھ نے تالیاں بھی بجائیں اور چند لوگوں نے پجاری ایک دھوکہ باز ہے کہہ کر آپس میں کانا پھوسی بھی کرتے رہے۔ انسانوں کی طرح شکار کی تلاش کرتے کرتے تھک ہارنے والے شکاری کتے بھی پجاری پر گالیوں کے انداز میں بھونکنے لگے" اس طرح سازش کرنے والوں کا تعارف کراتے ہیں۔

ناول

کوئمپو نے کنڑا کو دو بڑے ناول دئے ہیں۔ خاصیت اور اہمیت کے نظریہ سے بھی یہ بہت اہم ہیں کانور ہیگڈتی ۱۹۳۶ء میں جیسے ہی شائع ہوئی ضخیم ناولوں کی اشاعت میں اضافہ ہوا جیسے کارانت کی مرل متی گے ۱۹۴۲ء ماستی کے اچن سونایک ۱۹۳۹ء گوکاک کا سمر سوے جیون ۱۹۵۹ء راؤ بہادر کی گراماین ۱۹۶۰ وغیرہ اسی طرح کوئمپو کی شری راماین درشنم ۱۹۳۹ء میں رزمیہ کی تخلیق سے کنڑا میں رزمیہ کی کافی تخلیقات ہوئی ہیں اپنی تخلیقات پر مرکزی ساہتیہ اکادمی اور گنان پیٹھ ایوارڈ سب سے پہلے حاصل کئے۔ کرناٹک سرکار نے پمپا انعام کی تاسیس رکھی تو اس کو سب سے پہلے حاصل کرنے والے کوئمپو تھے اس طرح کئی شروعاتی انعامات کو حاصل کر کے اپنے متاخرین اور ہم عصر ادیبوں اور شاعروں پر ظاہری و باطنی اثرات چھوڑے ہیں۔ پمپا کا قول ہے کہ تمام مخلوقات میں انسان بہتر ہے۔ (حقیقت میں یہ جینہ سینا چاریہ کا قول) اور یہی بات کوئمپو کے ادب کا مرکزی احساس ہے ان سارے اسباب کی بنا پر اس دور کو کوئمپو کا دور کہا جاتا ہے (کے ایس بھگوان کوئمپو یگ) مختلف نقادوں نے اپنے مضامین میں پمپا سے کوئمپو تک کی باتیں حوالے کے طور پر دی ہیں۔

کانور ہیگڈتی جب پہلی بار منظر عام پر آئی تو کنڑا ادب کی دنیا کو ایک نئی دنیا کا دروازہ کھلتا ہوا

معلوم ہوا۔ ملناڈ کے گھنے جنگلات، وہاں کے گوڈا جوکس (پجاری) مزدور، ان کا کھانا پینا، اندھے عقیدے ایک دو ہوں تو بیان کیا جائے۔ ملناڈ کے گوڈے لوگوں کا رعب دبدبہ ان کا چھوٹا پن ان کا شرابی پن ان سبھی چیزوں کی زندہ تصویریں پیش کرنے کے سبب سے گوڈے لوگوں کے غصہ کا شکار پجاریوں کا چھوٹا پن اور ان کے اندھے عقیدوں کے پھیلانے کی سازش کو فاش کرنے کے باعث برہمنوں کے غصے کا شکار دھر مستھلا شری منجوناتھ سوامی کو منتیں ماننے اور اس میں ناکام ہونے کی تصویریں پیش کرنے وہاں کے در ماوھیکاری کے غصہ کا ہو ویا کے کردار میں اپنے آپ کو پیش کرنا اور فطرت کے نظاروں میں اپنے آپ کو بھلانے والا جذباتی ہونے کے باعث نقادوں کی نکتہ چینی کا مرکز بنے۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی تخلیق کے ابتدائی حصہ میں قارئین سے گزارش کی ہے کہ "میری اپنی اس اولین تخلیق پڑھنے والوں کی خدمت میں گزارش اس کو کہانی کے نظریہ سے مت پڑھئے۔ اطمینان سے طمانیت اور سوچ سمجھ کر پڑھئے یہاں جن چیزوں کی مصوری کی گئی ہے یہ ملناڈ کی زندگی کے سمندر کا ایک قطرہ ہے" اگر ایک قطرہ میں اتنی ساری چیزیں سمودی گئی ہیں تو اگر ساری چیزوں کی مصوری کی ہوتی تو کیا ہوتا؟

کانور ہیگڈتی کا مرکزی کردار سبما ہے۔ یہ ناول کے اس کردار کی آوارہ گردی، پھر اس کا اختیار حاصل کرنا اور اخلاقی جو گراوٹ آتی ہے وغیرہ کے باعث جو تاثر چھوڑتی ہے اس لحاظ سے اس ناول کو کانور سبما ہیگڈتی کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں۔ چندریا گوڈا کا رعب دبدبہ، ہوویا کے جدید خیالات اور قدرت کے حمد و ثنا گانا؛ اپنے خاوند کے ساتھ، جو اس کا ہمیشہ مخالف رہا لیکن اس کے ساتھ ہی ازدواجی زندگی گزارنے والی سیتا وغیرہ ایسے ہی بیسیوں کردار ناول میں آتے ہیں اور زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں۔ طنز و مزاح کو "شودر سنگھ کی مہا سبھا میں" کا حصہ بہترین مثال ہے۔ وہاں ہونے والے تقاریر فیصلے آخر کار ان سے حاصل نہ ہونے والے نتائج اس قوم کے بارے میں

لکھی جانے والی تقدیر ہے یہاں شکار کی تفصیل ہے۔ سب سے زیادہ گھنے جنگلات کی تفصیل ملے گی۔ جس کے پڑھنے کے بعد یہی محسوس کیا جائے گا کہ اتنے دنوں تک یہ ملناڈ کہاں چھپا ہوا تھا۔

دوسری ناول ہے ملے گل لِ مدگلو اس کی اشاعت ۱۹۶۷ء اور رزمیہ شری راماین ورشنم کی اشاعت کے بعد کانوڑ ہیگڈتی میں قدرتی مناظر کے گیت، روحانی درشن جدید خیالات یہاں سے وہاں تک بچھے ہوئے ہیں تو اس رزمیہ میں دعائیہ اور اخلاقی بنیاد مرکز بنا ہوا ہے۔ ان دونوں سے مختلف نچلے طبقے کے لوگوں کو دھیان میں رکھ کر مصوری کی گئی۔ مخصوص ناول ملے گل لِ مدگلو۔ ناول میں قارئین کے لئے ایک ہدایت ہے کہتے ہیں یہاں کوئی اہم نہیں ہے کوئی غیر اہم نہیں ہے یہاں کوئی بھی اونی نہیں ہے! یہاں مواقع ہوشیاری کی پیٹھ چڑھے ہیں۔ اس طرح یہاں کہانی کا ہیرو ہیروئن کوئی نہیں۔ یہاں بہنے والی ندیاں، گھنے جنگلات آئی تی چنچل ہر ایک کردار اہم ہے یہاں کوئی پوجا نہیں ہے کوئی آدرش نہیں لیکن زندگی کی برہنہ نمائش ہے۔ ناول کی دنیا میں پیار ہے۔ جنسی تعلقات ہیں یہ کبھی پانی میں بہنے والے سوکھے پتے لکڑی کے ٹکڑے کبھی مل کر فطری طور پر بھٹکتے ہیں۔ مدگل اب تک کے ناولوں میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈراما نگاری

شیکسپیر کے ہیملٹ اور ٹمپلٹ کی بنیادوں پر کوئمپو نے دو طویل ڈرامے لکھے۔ ویسنا سول جس کی بنیاد ستیاوان ساوتری کے افسانے پر قائم ہے یہ ان کا پہلا ڈراما ہے جو نظم بے قافیہ میں لکھا گیا جدید کنڑا میں بھی یہی اولیت کا شرف رکھتا ہے ان میں سے اکثر ڈراموں کی تحریک رزمیہ اور داستانی موضوعات سے ہوئی ہے اور وہ سب نثر میں ہیں۔

مضامین اور تنقید

کوئمپو کے ملناڈ کی تصویریں نامی مضامین کا مجموعہ وِبھوتی پوجے، کاؤیہ وِہار، ساہتیہ پرچار، تپونندن، دروپدی یہ شری منڈ، رسوویسہ رز نگش منگلاگ، ششٹی ان مَن، منُجمت وشو پتھ، وچار کرانتگے آہوان وغیرہ تنقیدی اور تقریریں کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ آپ نے ناولوں کو لکھنے سے قبل ملناڈ کے جنگلات کی تفصیل قریوں کی مصوری، لوگوں کے مختلف رہن سہن کے طور طریقوں کے متعلق بہت ہی مخلصی سے لکھے گئے مضامین، ملناڈ کی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی کی طرح تومدا چیا بھوت، اجّین اجنجن کاڈینَجِ وَندراتری وغیرہ ہمارے ذہن میں بڑی دیر تک محفوظ رہنے والے گدگداہٹ پیدا کرنے والی یادوں کو محفوظ کر دیا ہے۔

کوئمپو کے تنقیدی مضامین میں تنقید کا دیہ مسیحا ہے، فکری مضامین اور انٹرویو شامل ہیں۔ ان کی تخلیقات میں پیپنلِ بھوجے، مہاشوجے کا تمیں سوَرَوَرَدَسری کنڈیلِ وغیرہ مضامین تنقید کے میدان کو وسعت عطا کرنے والے ہیں۔ انگریزی اور گریک ادب کے استعمال میں ہومر کی تمثیل یا ایپک تمثیل کو انہوں نے مہوپے کا نام دے کر اس کی تفصیلات دی ہیں۔ اسی طرح اپنی چترانگری کی چھوٹی نظم ہویار امائن درشنم رزمیہ نظم میں عظیم تشبیہ کا معنی خیز استعمال کیا ہے۔ کوئمپو نے تنقید میں کئی ایک الفاظ کو ٹمپو نے استعمال کئے جیسے بھوجے پرتما، ووحان، درشن ومرشے وغیرہ۔

آج کے بھارت کے برے دنوں کے لئے ہمارے سیاست دان ذمہ دار ہیں جن کے پاس دور اندیشی نہیں ہے۔ ذات پات کی جہالت اس کے لئے کیسے ذمہ دار ہے اس کا جائزہ انہوں وچار کرانتی گے آہوان (۱۹۶۴ء) پر ہت شاہی ہنگامہ مدھواچاریہ کے خیالات، شودر قوم کی بیداری،

میں لیا ہے۔ انہوں نے سنسکرتی کرانتی گے کیلئے نانندی ایک خصوصی مضمون ہے۔ کوئمپو جب مضامین میں اپنے خیالات کو واضح طور پر ظاہر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے کو جو خیالات پسند آتے ہیں چاہے وہ کڑوے ہوں چاہے وہ سخت ہی کیوں نہ ہوں انہیں ظاہر کئے بغیر نہیں رہیں گے اور کوئمپو کی یہی خصوصیت ان کی ہستی اسی میں چھپی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے انہیں اہم مانا گیا ہے۔

تصانیف

کوئمپو نے اپنی شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری اور ڈرامانگاری سے کنڑا ادب کو مالا مال کیا۔ ان کی ۷۱ تصانیف شائع ہو چکی ہیں ۱۹۲۲ء تا ۱۹۷۹ء تک ۲۸ شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں رامائن درشنم اہم ہے۔ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۷۴ء تک بارہ ڈرامے تصنیف کئے جن میں جلگار سمشان کرکشیتر، شودر تپسوی، بیرل گے کورل اہم ہیں۔ کانور سبماہیگڈتی ملے گلل مدمگل دو ضخیم ناول ہیں۔ اس کے علاوہ ایک قلمی خاکہ ملناڈ کے تصاویر، چھ تنقیدی کتابیں، پانچ تقریری ادب پر ہیں۔ سوانحی ادب پر تین جن میں یادوں کی کشتی میں نجّین دونی نل خود نوشت سوانح حیات ہے۔ ادب اطفال پر نو کتابیں ہیں۔ دیگر دو اور ترجمہ ایک، زندگی کے آخری ایام میں اس فلاسفر نے وشوامانوا کا کائناتی پیغام دیا جس کا مقصد یہ کہ مذہب ہو تو انسانیت کا اور راستہ ہو تو کائناتی، زندگی کی آخری سانسوں تک وہ اس کی تبلیغ کرتے رہے۔

ادبِ اطفال

کوئمپو نے بچوں کے لئے کہانی، نظمیں، کہانی والی نظمیں اور ڈرامے لکھے ہیں۔ ان میں بومن بلی کا کندر جوگی کافی مشہور کہانی اور نظم ہے۔ براؤننگ شاعر کی انگریزی نظم The Pied Piper of the Hanelin طویل نظم کو بنیاد بنا کر انہوں نے یہ نظم لکھی ہے۔

امل ان کتھے، گووِن ہڈ، ہانوز، بچوں کے لئے موڈن ن تمّ اور نن گوپالی نامی دو ڈرامے لکھے ہیں۔ سوانحی ادب بجتی پر یہ والمکی رامائن لکھا، گھروونوڈنے دیورڈ کے نامی ترجمہ شائع کیا۔ نجّین دونی نل ان کی اپنی سوانح حیات ہے۔

ان کے خواب

ہر ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ وشومانو ہوتا ہے۔ پروان چڑھتے ہم اس کو اقلیتی انسان بناتے ہیں پھر اس کو وشومانو بنانے کے لئے تعلیم کا فرض بتاتے ہیں۔ وشنومانو بننے کے لئے انہوں نے سات نکاتی فارمولہ دیا ہے۔

ماخذ: (۱) کوئمپو از کے یم منی کرشنپا، نامر کنڑا ساہتیہ اکادمی بنگلور۔ (۲) کنڑا ادب کی تاریخ آر ایس مگلی۔

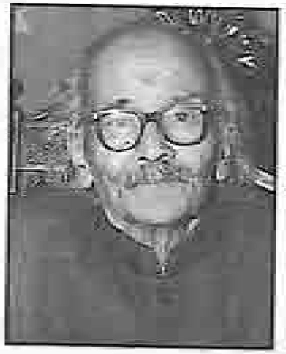

ڈاکٹر دَ۔را۔ بیندرے

ಡಾ॥ ದ.ರಾ. ಬೇಂದ್ರೆ

دتاتریہ رام چندر بیندرے کی پیدائش ۳۱ر جنوری ۱۸۹۶ء دھارواڑ کے منگل وار پیٹ میں ہوئی۔ ۱۸ ا ۱۹۱۴ء فرگوسن کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہیں مراٹھی شاعری کا تعارف ہوا۔ شارداسنڈلی کی رکنیت حاصل کی۔ ۱۹۱۹ء میں نرگند کے لکشمی بائی سے شادی کی۔ ۱۹۲۲ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'کرشنا کماری' کی اشاعت ۱۹۲۳ء میں گیلیز گپ' نامی انجمن کی بنیاد رکھی۔ ۳۲-۱۹۲۴ء دھارواڑ کی پرانی وکٹوریہ ہائی سکول میں بحیثیت مدرس ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۳۰ء کو میسور میں منعقد دسویں ادبی کانفرنس میں مصنفین کے اجلاس کی صدارت کی۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی دو نظموں کی اشاعت پر انہیں قید ہوئی (۱) نرَبلی (انسانی قربانی) کے لئے تین ماہ کی قید (۲) ہنڈر گے نخر نظم کے لئے ۶ ماہ کی قید ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں یم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال ممبئی میں منعقدہ ۲۱ کرناٹک ادبی کانفرنس کے مشاعرہ کی صدارت کی۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۰ء تک بے روزگار رہے۔ یہ دیکھ کر ماستی نے انہیں اخبار جیون کا مدیر بنایا۔ ۱۹۴۱ء میں سمیتی ہائی سکول گدگ کے میر

مدرس رہے۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۳ء تک کامرس کالج پونا میں کنڑا کے جزوقتی لکچرر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۴۳ء برہمنا بارا راشٹر کالج پونا میں کنڑا پروفیسر کی ملازمت کی۔ اسی سال شیموگہ میں منعقدہ ۲۷ ویں کرناٹک ادبی کانفرنس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس کی صدارتی تقریر ہی ان کی مشہور تصنیف ساہتیہ وِراٹ سوروپ ہے۔ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۶ء تک ڈی اے وی کالج سولاپور میں کنڑا پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت کی اور وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں ۵۰ ویں سالگرہ کا جشن منایا گیا۔ ۱۹۵۶ء آکاش وانی دھارواڑ کے ادبی مشیر رہے۔ سولاپور، پونا، دھارواڑ اور بنگلور میں ان کی ۶۰ ویں سالگرہ کا جشن منایا گیا۔ کنڑا ساہتیہ پریشد نے اعزاز بخشا۔ ۱۹۵۹ء میں اَرَل مَرل پر مرکزی ساہتیہ اکادمی انعام ملا۔ ۱۹۶۳ء میں تمکور بلدیہ کا اعزاز۔ ۱۹۶۴ء کو میسورو سیرہ میں ان کو اعزاز دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی مراٹھی تصنیف سمواد کو کیلکر انعام ملا۔ ۱۹۶۶ء میں جامعہ میسور نے انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ عطا کی۔ حیدرآباد ہندی پرچار سبھا نے انہیں ساہتیہ آچاریہ انعام سے نوازا۔ ممبئی میں ان کا ۷۰ واں جنم دن دھوم دھام سے منایا گیا۔ اسی سال حکومت میسور نے انہیں تاحین حیات وظیفہ مقرر کیا۔ یہ اعزاز ان کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اسی سال ان کی بیوی رحلت کر گئیں۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں پدم شری ایوارڈ عطا ہوا۔ جامعہ کرناٹک نے اعزازی ڈاکٹوریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۶۹ء مرکزی ساہتیہ اکادمی کی فیلو شپ کا اعزاز ملا۔ ۱۹۷۲ء پریار میں اڈپی مٹھ کی طرف سے منعقدہ ایک جلسہ میں کرناٹک کوی کل تِلک کا خطاب عطا کیا۔ ۷۵ ویں جنم دن کے یادگار موقع پر حکومت کرناٹک نے اس شاعر پر ایک دستاویزی فلم تیار کی۔ ۱۹۷۴ء میں ان کی تصنیف ناکُ تنتِ (شاعری) پر گیان پیٹھ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں کاشی ودیا پیٹھ نے اعزازی ڈاکٹوریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۸۱ء، ۲۶ر اکتوبر ممبئی کی ہری کرشن اسپتال میں وفات پائی۔

بیندرے کی شاعری

بیندرے جدید کنڑ شاعری کے ایک ممتاز علم بردار کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں اور جدید کنڑا کی عظیم ترین پیداوار میں شامل ہیں۔ امبیکا تنیادتا کے قلمی نام سے انہوں نے بہت سی مثنویاں اور غنائیہ نظمیں لکھیں۔ شاعری کا آغاز کرشن کماری سے ہوا تھا۔ گری سے شروع ہو کر باہتر اسک بیس مجموعہ کلام شائع کر چکے ہیں۔ چند اور مجموعوں کے اختلاط کو ازلو مرلو کے نام سے شائع کیا۔ اپنی شاعری کے لئے مادی، حیاتی، ذہنی اور مافوق الفطری موضوعات زندگی کے سارے دائروں سے حاصل کئے ان کی طرزیں اکثر تغزلانہ ہیں مگر ان کی بعض نظموں میں مثنویاتی تسلسل بھی موجود ہے۔ مثلاً سکھی گیتا ایک طویل نظم ہے جو ان کی ازدواجی زندگی کے بیان پر مشتمل ہے۔ موروتی میں نظموں کا ایک سلسلہ جمع کر دیا گیا ہے۔ جن کی اہمیت اشاریت پر مبنی ہے۔ پاڈویاڈو مرثیہ ہے جو ذاتی حادثے پر لکھا گیا بعض غنائیہ نظموں کا پس منظر خیالی افسانہ یا ڈرامہ ہے۔

ایک طرح سے ان کی نظمیں جذبات سیلاب نہیں بلکہ در حقیقت اخلاقی سطح پر ذہنی مشقتیں اور تجربے ہیں ان میں فکر اور تجربے کی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ یہ ان کی بنیادی اہمیت ہے۔ اپنی بہترین شکل و صورت میں وہ شوخ رنگ کی ہیں ان میں ایک پر اسرار دل کشی موجود ہے جو ذہنی روحانی خیالات سے معمور ہے۔ تاہم اس سے ان کی غنائیہ خوبی میں کمی نہیں آنے پاتی۔ ایسی ایک بلند پایہ نظم ان کی 'بھاوگیتے' ہے جو غنائیہ کی حقیقت پر ایک غنائیہ ہے۔ 'نکی بارو تیمدے' توڈورا ایک اور نظم ہے جو کائناتی تصور پر مشتمل ہے اور جس میں طائر وقت کی پرواز کا بیان ہے۔ گنی یونا یارا میں شاعر نے مسرت کاملہ کا بیان کیا ہے جو زندگی کا حاوی اصول ہے۔ تمنا چیلا، کروڈا کا نچنا اور چند اور نظمیں غریبوں کی انتہائی غربت اور ملک کی زندگی میں عدم مساوات پر روشنی

ڈالتی ہیں۔

تمنا چیلا میں بھوکے انسانوں کی مایوسی انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے اور اس کا اظہار ان پُر زور اور پر اثر الفاظ میں ہوتا ہے۔

"ایک مردہ دیوتا پر ایک گنبد تعمیر کرنا، لوبان جلانا، سانس کی گھنٹی بجانا اور درد اور موت کا کرب، غریبوں کے نوالوں کی تحلیل یعنی پیٹ کی مانگ جو اگر مل جائے تو ساری زمین کو ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر دے"۔

کروڈنا کا نچنا میں دولت مندی کا غرور کچھ ایسے تخلیقی تصورات کے پردے میں بیان کیا گیا ہے جس میں تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہ نظم اس بات کی ایک مثال ہے کہ چھوٹے موٹے غنائیوں میں بھی کیسے بلند درجے کی شاعری کی جا سکتی ہے۔

بازاری اور عوامی زبان کے استعمال اور اس کی اہمیت کو نمایاں کرنے میں بیندرے پر کوئی سبقت نہ لے جا سکا۔ عوامی شاعری کے اثر میں ڈوبے ہوئے انواع و اقسام سے انہوں نے کام لیا ہے۔ انہوں نے اوزان و بحور کی تمام قسموں کا تجربہ کیا ہے جن میں ویدک بھی شامل ہے۔ ان کے یہاں خیالی اور مافوق الطبیعیاتی عنصر کی کثرت ہے جس کی وجہ سے ان کی زبان اور الفاظ کچھ مغلق اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں ان کے ذہنی نظریات اور روحانی تجربات ان کے وجود اور تحریر کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک سمجھ دار قاری کے لئے بھی ان کے مطلب کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ان کے بعض کلام میں بعض اوقات الفاظ اور قافیوں کی بڑی کثرت نظر آتی ہے۔ جو اصل مطلب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ ان ساری خامیوں کے باوجود ان کی بہترین نظموں میں ایک آفاقی احساس ہے جو فطری طور پر کلیاتی ہے اور ایسے مضامین جو معانی اور مطلب سے لبریز ہیں ان کی شاعرانہ تخلیق سے کنڑ شاعری مالا مال ہے۔ اس نے اس کی حدود کو ایک نئی

وسعت بخشی ہے اور اسے ایک غیر معلومی تابانی بخشی ہے۔ (کنڑ ادب کی تاریخ، صفحہ ۲۳)

نُوچارمنجری میں بیندرے نے فکری مضامین لکھے ہیں ان کی ایک اور کتاب ساہتیہ وراث پر غور کیا جائے تو نثر مختلف صنفیں تنقید تحقیق سوانح حیات، زبان اور ثقافت کے بارے میں فکر ملے گی۔ فکریات تقاریر، مقدمے ان تمام نثری صنفوں پر ان کو عبور حاصل تھا۔ بیندرے نے صدہا مقدمے لکھے اپنی نظموں کے لئے ایک تعارفی پارہ لکھ کر قاری کو اس نظم سے متعارف کرانا ضروری خیال کرتے ہیں ان کے فکری احساس ادب اور تنقید ہیں۔ مہاراشٹر کا مراٹھی ادب، ادب تحقیق لکشمش کی جنمی بھارت کے متعلق مضامین کنڑ ادب میں چار اہم رتن 'ماتیلَ جیوتی، ساہتیہ وراث سوروپ، کماردیاس، مت دھرم مت آدھنک ماؤان کے علاوہ مرہٹی زبان میں لکھی گئی سنت مہاناچاپوزن شنبورل سمواد و ٹھل سیمردایہ یہ بھی نثری اصناف کو ایک نئی سمت عطا کرتے ہیں۔

ڈرامہ نگاری

بیندرے بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن انہوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں ڈراموں کا مجموعہ ناٹک سمپٹ ان میں کل چودہ ڈرامے ہیں لیکن اسٹیج کے لئے ان میں صرف دو یا تین ناٹک ہی ہو سکے۔ ان میں نامکمل ڈرامے بھی شامل ہیں۔ تلے وِنڈا، کلیان دَکلیانی، ستی پنج، ان ناٹکوں کے لئے لکھے جانے والے گیت جب پڑھے جاتے ہیں تو ایک نامکمل ناٹک کا احساس ہوتا ہے اور اس میں کوئی شان و گمان بھی نہیں۔

ہچّاناگلو ظاہری طور پر مزاحیہ ڈرامہ لگتا ہے لیکن باطنی طور پر سماج کی بدانتظامی، ناانصافی کے خلاف انہوں نے شدید احتجاج کیا ہے۔ سماج کے ناانصافیوں کو ختم کرنے کے لئے سخت قدم

اٹھاتے ہیں۔ طنز کے شدید تیروں کا انتخاب کر کے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماج کا انتظامیہ کے پاگل پن کو طنزیہ طور پر دکھانا ہی ان کا اصل مقصد ہے۔ اقتدار سے چمٹے رہنے والے قائدین بھی اس کا نشانہ بنتے ہیں، پالتو جانوروں کو بچوں سے زیادہ پیار کیا ہے۔ کتے بلیوں کی شادیاں رچانے والے راجے مہاراجوں کو اپنے تنقید اور طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جی ایس آمور نے بیندرے کے ناٹکوں کو مطالعہ کی سہولت کے لئے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پاگل پن کا کھیل (ہچّاناگل) المیہ (آوِدھا) طربیہ (سنکماز)

"گول" ناٹک جدید سماج کی عکاسی کرتا ہے اس ناٹک میں آنے والے سات لوگ سماج کے مختلف لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں گول کا ہیرو بہت بڑا رئیس ہونے کے باوجود آدرش وادی ہے اپنے اطراف رہنے والے لوگوں کو دیش کے مختلف کاموں میں جتا دیتا ہے۔ اس میں آنے والے دوستوں کا چال چلن بیندرے کے گلیز کمپ میں ہونے والے تجربات ہی سامنے آتے ہیں۔ اس ناٹک کی ایک کمزوری بہت زیادہ انگریزی تہذیب کا استعمال ہے۔ ہیرو نے انگریزی زبان سیکھی ہے اس کے لئے انگریزی کا حد سے زیادہ استعمال کرنا سانس کو روکنے کے برابر معلوم ہوتا ہے اور اتنی انگریزی کا استعمال اچھا نہیں لگتا۔ اس سے ڈرامہ نگار کچھ بھی اپنے طور پر ثابت کرنے والا نہیں ہے۔

ترکرپڑگ طنزیہ مزاحیہ ڈرامہ ہے جو شدید نکتہ چینی اور تنقید سے پر ہے۔ جاترے اور سایو آٹ ان دونوں ڈراموں میں کافی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ سیاست دانوں کے پاگل پن کا کھیل، خود غرضی اختیار حاصل کرنے کے لئے ادھکار شاہی کا استحصال یہی ناٹکوں کا اہم مقصد ہے۔

حقیقت میں بیندرے کو خود ان کی پسند کا ناٹک ملے یا گیلیز پیدائشی فطرت مرنے تک نہیں جاتی مثل کے مطابق بھیس بدل کر نئے جیون کا آغاز کرنے جارہے وظیفہ یاب جج پدمانابھ رایا

وظیفہ یاب پولیس افسر وشواس رایا فطرت کے مطابق پرانی عادتوں سے مجبور اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ ناجائز تعلقات بنائے رکھنے والی سندرابائی ہی حقیقت میں تبدیلی ہوتی ہے لیکن یہ دونوں اس کو سمجھنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔

دیوؤ مٹے ایک اشاراتی ناٹک ہے۔ ظاہری طور پر اس میں ایک ساس بہو کا جھگڑا ہے۔ ان دونوں کے درمیان پھنس کر بلبلانے والا شخص ستیہ ونت اس مسئلہ میں کافی دکھ درد اٹھانے والے ستیہ ونت کو اچانک اس کا ایک دوست گروراجا کے آجانے سے راحت مل جاتی ہے وہ کچھ ایسی باتیں بتاتا ہے جس پر کور عمل کرنے سے مسائل کا حل مل جاتا ہے۔ یہی اس ناٹک کا تھیم ہے۔ ایک گھر کے مسائل کو سلجھانے کے لئے جب اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں تو دیش کے مختلف مسائل کو حل کرنے کے لئے اور کیا کیا کچھ کرنا نہیں پڑے گا۔ یہی ڈرامانگار کا اصل مقصد ہے۔ دوست گروراجا کے کہنے کے مطابق گھر کا اور دیش کا ایک ہی حال ہو چکا ہے۔ کسی بیماری کو کوئی بھی ایک لنگڑی دوا دیتے دیتے یہ خدا کی زمین جاکر شیطان کا گھر بن چکا ہے اور اس کو پھر سے گھر کا روپ دینے کے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔

بیندرے کے مطابق بھاگیرتی نامی المیہ ڈرامہ ایک معنی میں بھاگیرتی کا المیہ کہنے کے بجائے اس حالت میں رہنے والے لڑکی کو دیکھ کر ہم عمر سماج کی لڑکیوں کا طنز اور مذاق کے بارے میں بتاتا ہے۔ شادی نہ ہونے والے برہمن سماج کی لڑکی دیکھ کر وہی سماج کی عورتیں اس کا مذاق اڑاتی ہیں۔ اس کا ہر قدم اور اس کے ہر طور طریقے کو گمان کی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ یہ سب چیزیں ناٹک کو المیہ کی طرف لے جاتی ہیں۔ بیندرے لڑکیوں کی باتوں کو جو بھاگیرتی کے بارے میں کی جاتی ہیں اسے ہنسی مذاق کہتے بھی ہیں لیکن یہ تو دھواں ہے برہمن طبقہ کے بیواؤں کے مسائل اپنی نظموں میں بھی کیا ہے وہ ہیں پٹ دو دھوے، بیند ہندرے۔

اس کے برعکس اُدھار سماجی مسائل کو ابھارتا ہے۔ گاندھی کے عہد کا آخری زمانہ اور اس کا اہم مسئلہ ہریجنوں کا تھا اور اس مسئلہ کا حل کرنا ہی اس ناٹک کا اہم کارنامہ ہے۔

بیندرے کے طربیہ کہلانے والے ڈرامے ہوس سمسار شوبھنا وغیرہ خاندانی مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں۔ نیا کنبہ (ہوس سمسار) ناٹک میں گنڈن کے تیرتھ یاترا سے واپس آنے تک نئی تبدیلیوں کو اپنا کر بیٹا بڈن پورا بدل چکا ہے۔ داماد رنگنا بیٹی کی منگنی میں داخل ہونے والی انبکا کو دور کرنے کے لئے بڈن خود شادی کر لیتا ہے۔ باپ بیٹی کے تعلقات، دادا پوتری کے تعلقات وغیرہ کو بڑے احتیاط سے بحث میں لایا گیا ہے۔ سارا کنبہ ایک خوشی اور اطمینان کی سانس لیتے وقت بزرگ گنڈن کا انتقال اس طرح یہ ناٹک زندگی میں آنے والے اچانک حادثوں کے بارے میں روشنی ڈالتا ہے شوبھنا میں اہم دو نسلوں کے درمیان پیش آنے والے رگڑ کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناٹک کی ہیروئن شوبھنا ہے۔ جیجو بائی اور تنگا بائی بہت پرانی روایات کے حامی عورتیں ہی شوبھنا اور چترا نئی نسل کی نوجوان لڑکیاں ہیں۔ روایتی خیالات کی وہ مخالفت کرتے ہیں اس کے علاوہ آزادی، خودی وغیرہ کے فتح کا جھنڈا لہرانے والیاں ہیں۔ اس ناٹک میں بیندرے نے تنگا بائی اور جیجو بائی کے درمیان مکالموں کے ذریعہ ان کی زندگی میں نہ حاصل ہونے والے کھوئے ہوئے خوشی کے لمحات کو انہوں نے سیاؤسٹ بنتے ہوئے لمحات پر توجہ دی ہے۔

بیندرے کا آخری ناٹک آطرح اِی طرح ناٹک میں ایک ناٹک ہے۔ زندگی کے ناٹک کے خصوصیات کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ زندگی اور فن یہی ناٹک کا اہم حصہ ہے اس اہم کردار واسنتی کہتی ہے، زندگی اور ناٹک دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ناٹک کے ذریعہ زندگی کو برباد نہیں کرنا چاہئے۔ شاید اس ناٹک کے ذریعہ بیندرے نے یہی پیغام دینا چاہا ہے۔

شاید بیندرے بنیادی طور پر شاعر ہونے کی وجہ سے ناٹکوں پر زیادہ توجہ نہیں دی لیکن یہ

ڈرامے جاترے، سایو آنا، اُدھار گول کسی بھی نتیجہ خیز ناٹکوں سے کم نہیں ہیں ان کا نہ لکھا ہوا تلے وٹا اور کلیان وِکلیانی اگر پورے ہو جاتے تو بہت ہی اہم ناٹک ہوتے۔ کارناڈ نے اس کا فائدہ اٹھایا یہ خوشی کی بات ہے امور کے مطابق شمالی کرناٹک کے سٹیج پر شری رنگا سے قبل کے ناٹک کے دور میں وہ سب سے اہم ڈرامانگار کہے جانے میں کوئی شک و گمان نہیں ہے۔

تصانیف

۱۹۲۲ء سے انہوں نے کنڑا ادب کو مالا مال کرنا شروع کیا۔ ان کا کل تصنیفی سرمایہ ۲۹ کتابوں پر منحصر ہے جن میں شاعری کی ۷ ۳، ڈراما کی ٦، تنقیدی و فکری ۹، افسانہ ایک، ادارِیاتی ۵، انگریزی ایک، مراٹھی ۴، دیگر زبانوں سے کنڑا زبان میں ترجمہ کی ہوئیں سات کتابیں ہیں۔ بیندرے کی شعری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی باتوں میں جادوگری ہے تو شعروں میں عوامی ادب کا اثر ہے جس کی مثال تجیس کروڑ، اناو تارا، بیلکو، الق بکا سُرر راجیہ دَلّی، ہنبلی یانو، نکی بازیتدے نوڈِدِر، بھاوگیتے، گنگاوترنا، گرِزِدا کا نچنا ہیں۔

ماخذ: (۱) دارا بیندرے۔ از ڈاکٹر ڈی منگل پریہ درشنی۔ ناشر: کنڑا ساہتیہ اکادمی بنگلور

۲) کنڑا ادب کی تاریخ، آرلیس موگلی، ناشر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی

ڈاکٹر ماستی وینکٹیش آئینگار

ಡಾ॥ ಮಾಸ್ತಿ ವೆಂಕಟೇಶ ಅಯ್ಯಂಗಾರ್

ماستی وینکٹیش آئینگار کی پیدائش ٦/جون ۱۸۹۱ء وفات ۱۹۸٦ء ضلع کولار کے ہونگین ہَلّی میں ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں ان کی شادی پنکجما کے ساتھ ہوئی اور اسی سال ان کا پہلا افسانہ رنگن مدوِلے شائع ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں بی اے ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں میسور سول سروس امتحان میں پہلا درجہ حاصل کیا۔ ۱۹۱۴ء میں انگریزی ادب میں یم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال پروبیشنری اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۲۰ء میں مختصر افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں بلگام میں منعقدہ ادبی کانفرنس کی صدارت کی۔ ۱۹۴۲ء میں سرکاری ملازمت میں انہیں بہترین کارکردگی پر مہاراجہ میسور کی طرف سے راجہ سیوا پرسکتا کا خطاب دیا گیا۔ ادب میں انہوں نے ایک اپنا مقام پیدا کیا۔ اسی سال کنڑا ساہتیہ پریشد کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں سرکاری ملازمت سے وظیفہ حاصل کیا۔ ۴۸-۱۹۴۳ء شعری مجموعہ نوراتری میں منعقدہ بھارتیہ دکشن بھاشا سمیلن کی صدارت کی۔ ۱۹۴۹ء چن بسوا نائکا کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۹۵۴ء پونا یونیورسٹی کے زیر سرپرستی منعقدہ بھاشا سمیلن

میں شعبۂ راشٹر بھاشا کی صدارت کی۔ ۱۹۵۶ء میں چکا ویر راجیندر تاریخی اور ضخیم ناول جو کل ۵۰۷ پر پھیلی ہوئی ہے کورگ کی تاریخ سے وابستہ ہے شائع کی۔ ۱۹۵۶ء میں کرناٹک یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹوریٹ عطا کی۔ ۱۹۶۱ء کل ہند مصنفین کی کانفرنس کی صدارت کی۔ ۱۹۶۳ء میں پی ای این کے نائب صدر چنے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں مختصر کہانیوں کا مجموعہ جلد ۱۲ اور ۱۳ کو مرکزی ساہتیہ اکادمی انعام ملا۔ ۱۹۷۲ء میں طویل نظم شری رام پٹا بھشیکا کی اشاعت شریواس امپینڈ ناگر تھا کا اقتساب ریاستی ساہتیہ اکادمی انعام حاصل کیا اور پی ای این شعبۂ بھارت کے صدر بنے۔ ۱۹۷۳ء میں مرکزی ساہتیہ اکادمی فیلوشپ کی ڈگری عطا ہوئی۔ ۱۹۷۷ء میں جامعہ میسور نے اعزازی ڈاکٹوریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۸۳ء ان کی تصانیف سمگر ساہتیہ کے لئے گنان پیٹھ ایوارڈ عطا ہوا۔ ۱۹۸۴ کنڑا ساہتیہ پریشد کے اعزازی رکن بنائے گئے۔ ۱۹۸۶ء میں وفات پائی۔

شاعری

ماستی جدید کنڑا کے ایک عظیم قلم کار ہیں۔ انہوں نے سری نواسا کے قلمی نام سے کثیر تعداد میں غنائیہ نظمیں اور مثنویاں کہی ہیں اور کنڑا شاعری میں ایک ٹھوس اور بے مثال اضافہ کیا ہے۔ وہ ایک ممتاز شخصیت کے مالک ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید ہونے کے باوجود انہوں نے اس سرزمین کی تہذیب کا جوہر اپنی ذات میں سمولیا ہے۔ خدا سے عقیدتمندی اور تسلیم ورضا، نیکی پر ایمان، وطن کی محبت اور طبقہ نسواں کی عزت کے ساتھ ہی ساتھ دوسری خوبیوں نے ان کے وجود میں گھر کر لیا ہے۔ اور ان کی تصانیف میں ان کا پرزور اظہار ہوا ہے۔ نثر اور نظم دونوں میں قصہ گوئی کی ان کو بڑی مہارت ہے ان کا اسلوب سادہ اور راست ہے اس میں فنکارانہ اظہار اس طرح ہوا ہے جو فن کو چھپالیتا ہے۔ بناہا، اروناتاورے، چلووو، ملارا، سُنیتا، منوی ان کی شاعری کے چند

مجموعے ہیں۔ بناہا اور منوی میں ان کی مذہبی نظمیں ہیں۔ اگرچہ وہ قدیم طرز کی مذہبی عقیدتمندی کی حامل ہیں لیکن ان میں کوئی نقالی نہیں ہوئی ہے بلکہ شاعر کے ذاتی تجربے سے پیدا ہونے والے احساسات وخیالات کی دھڑکنیں ان میں سنائی دیتی ہیں۔ بلند خیالی اور شدت جذبات سے زیادہ یہ نظمیں اور گیت سراسر خلوص سے لبریز ہیں اور اسی لئے انداز بیان میں بالکل فطری اور واضح ہیں۔ تاورے اور چلوو ادیوی نامی دو نظموں میں شاعر نے وہ تاثرات بیان کئے ہیں جو حیات وکائنات کے مطالعے نے اسے بخشے ہیں۔ آخر الذکر نظم میں شاعر نے یہ حسین منظر نگاری کی ہے کہ وندھیا میں سورج اپنی تابانی کے ساتھ طلوع ہوا ہے اور ایک عورت پانی لینے کو ندی پر پہنچتی ہے یہ بتایا ہے کے جمالیات کا اصول جو ہمارے دلوں کو موہ لیتا ہے۔ وہ دنیا کا انسانی پہلو ہے جو دراصل اَن دیکھے خدا کی سازش کا کھیل ہے۔ ''ملارا'' اسّی سانٹ کا ایک گلدستہ ہے جو اشخاص اور واقعات کے موضوعات پر ہیں 'گوڈر ملی، رام نوی، مُوکنا منگلو، نوراتری' ان کی چند مثنویاں ہیں۔ رام نوی میں ایک گاؤں کے کھیا کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ رام کی بیوی سیتا اور بھائی لکشمن کے ساتھ جلاوطنی کے زمانے میں سفر کرتے ہوئے ایک پیڑ کے سائے میں کھڑے ہوئے تھے اور ہر سال اس روز نظر آتے تھے۔ کھیا کو اس قصے پر ایمان اور اعتقاد تھا اس نے شاعر کو صداقت پر غور کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے صداقت وہ چیز ہے جو ہماری زندگی کو نورانی بنادیتی ہے اور جو چیز ایسا نہیں کرسکتی وہ فقط صداقت کی ایک بے جان گڑیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جو اعتقاد آپ کو راہ راست پر لگاتا ہے وہ صداقت ہے اگرچہ وہ ایک وہم اور فریب ہی کیوں نہ ہو نوراتری میں بیس مثنویاں ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں اور معرّیٰ میں لکھی گئی ہیں۔ مثنوی کی سلاست اور روانی سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ نظم غالباً نثر جیسی ہے لیکن ایک نازک شاعرانہ احساس نے کہانیوں میں دلکشی پیدا کردی ہے۔

مختصر افسانہ نگاری

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماستی اولین بزرگ ترین مختصر افسانہ نویس ہیں۔ اب تک ان کے ساٹھ سے زیادہ افسانے ہو چکے ہیں۔ وہ ایک فطری قصہ گو ہیں اور ان کی تحریر میں ایک خاص قسم کی روانی اور سہولت ہے ان کے سارے افسانوں میں ماحول کی زندگی میں گہرے ذوق عوامی کہانیوں کے بارے میں تجسس اور کنڑا والوں کی تہذیب کے متعلق خصوصی احترام کے جذبات کا مظاہرہ ہوا ہے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ ان حدود نے وسیع تر ہو کر ہندوستان کی زندگی اور ادب بلکہ ساری دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے۔ اسی لئے وہ رامانجا چاریہ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں اور ساتھ ہی ساتھ جرمنی کے عظیم شاعر ۔ گئٹے کی زندگی کے آخری دن کے بارے میں کہانیاں لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا کچھ مواد انگلستان فرانس اور جاپان جیسے بیرونی ممالک سے لیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں 'ہما کو تا دندا بندا ملے' اور گوتما کتھے سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ پرانے مواد کی بنیاد پر افسانے کی عمارت کھڑی کرنے کی تحریک کا لیداس کے شکنتلا سے ہوئی تھی۔ سبّنا ان کا عظیم مختصر افسانہ ہے۔ اگرچہ طوالت اور وسعت میں ایک معمولی افسانے سے بڑھا ہوا ہے اس میں ایک موسیقار کی زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے جس نے زندگی کی حکمت اپنی موسیقی سے سیکھی۔ روایت کا ایک فطری اور سیدھا سادہ طریقہ ماستی کا اصل فن ہے۔ دراصل کسی پابندی تکنیک کی غیر موجودگی ہی ان کی تکنیک ہے۔ ان کے بہترین افسانے اپنے فن کے لئے مشہور ہیں جو فن چھپاتے ہیں اور جن میں کوئی تکنیکی اصول نہیں پایا جاتا۔ انسانی زندگی اور کردار اور خصوصاً کنڑ تہذیب کے بلند پہلوؤں کے لطافت آمیز بیان میں انہوں نے جو نمایاں کامیابی حاصل کی

ہے وہ مایہ ناز اور لائق تحسین ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک مہک اور قدر و قیمت ہے جسے ہیئت اور مواد دونوں کے لحاظ سے ماستوی کہنا بجا ہو گا۔

ماستی نے دو بڑے تاریخی ناول لکھے ہیں چنا بسوا نایک اور چک ویرا راجیندرا ان میں انہوں نے بڑی فن کارانہ مہارت سے یہ بتایا ہے کہ کلاڈی اور کورگ کے راج گھرانے اپنی اخلاقی گراوٹ اور اندرونی خلفشار سے کس طرح برطانوی استعمار کے شکار ہو گئے۔

تصانیف

افسانوی ادب (مختصر کہانیوں کے مجموعہ) ۱۵ جلدوں میں شائع کی۔ شاعری کی ۱۳ کتابیں شائع کیں۔ ڈراموں کی ۱۷ کتابیں۔ تنقید اور تقاریر کی ۴۔ سوانحی ادب پر ۴۔ سنسکرت فکری ادب پر ۱۱۔ تراجم ۸۔ اداریاتی مجموعے ٦۔ انگریزی کی ۱۵ کتابیں شائع کی ہیں۔ اس طرح کل ۹۲ کتابوں کے مصنف تھے۔ ماستی وینکٹیش آئینگار کو کنڑا اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ شاعر، افسانہ نگار، ڈرامانگار، نقاد، صحافی اور مفکر تھے۔ ان سب میں سب سے زیادہ مختصر کہانیوں پر زیادہ توجہ دی۔ تقریباً سات دہوں تک یہ مختصر کہانیوں کی تخلیق کرتے رہے اور اسی سے وہ مشہور ہوئے اور کنڑا دب کو اس صنف سے مالا مال کیا۔

ماخذ: (۱) ماستی۔ از رام لکشمی نارائن۔ ناشر: کنڑا ساہتیہ اکادمی بنگلور۔ (۲) کنڑا ادب کی تاریخ، آر ایس موگلی، ناشر ساہتیہ اکادمی

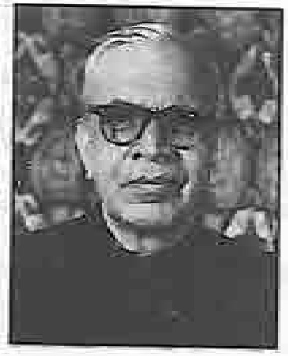

ڈاکٹر ونایک کرشنا گوکاک

ಡಾ॥ ವಿ. ಕೃಷ್ಣ ಗೋಕಾಕ್

پیدائش ۱۹/اگست ۱۹۰۹ء۔ وفات ۲۸/اپریل ۱۹۹۲ء

۱۹۲۵ء، ساونور (ضلع دھارواڑ) سے ہائی سکول کا امتحان پاس کیا۔ انگریزی زبان سے شاعری کی شروعات کی۔ د۔ را۔ بیندرے کی قائم کردہ انجمن گیلے یر گُنپ کی رکنیت حاصل کی۔ اپنے استاد تخن د۔ را۔ بیندرے کا تعارف کروایا اور دوستی کی بنیاد کو مضبوط کیا۔ اسی سال بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ یلیس یا انجمن اور جے کرناٹکا ماہنہ رسالہ کے نقاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں شاردا دیوی کے ساتھ دھارواڑ میں شادی کی۔ ۱۹۳۱ء میں ممبئی یونیورسٹی سے انگریزی زبان میں یم۔ اے کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ فیرگوسن کالج پونا میں بحیثیت لکچرر ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۳۴ء اپنی ناول سمرسوے جیون کا پہلا حصہ شائع کیا۔ رائچور میں منعقدہ ادبی کانفرنس کی صدارت کی ۱۹۳۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے۔ ۱۹۳۸ء یڈنبرا میں اپینڈکس کا کامیاب آپریشن ہوا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی تعلیم میں ایک ہندوستانی نے امتیازی کامیابی حاصل کی۔

سانگلی ولنگٹن کالج میں نائب پرنسپل کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا، یہیں سے ان کی انتظامی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔ ۱۹۳۹ء میں اسی کالج میں بحیثیت شمالی کرناٹک کے تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی۔ ۱۹۳۵ء عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء گجرات ویزانگر کالج کے پرنسپال بنے۔ ۱۹۰۵ء میں شری اربندو اور شری ماں سے پہلی ملاقات۔ ۱۹۵۲ء دھارواڑ کرناٹک کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے عہدہ کا جائزہ لیا۔ ۱۹۵۶ء ممبئی کی ادبی کانفرنس میں ادبی سیمینار کی صدارت کی۔ اسی سال دلی ساہتیہ سماروہ میں کنڑا کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۵۷ء دیاواپرتھوی کی اشاعت۔ جاپان کا سفر کیا۔ پی۔ ای۔ ین کانفرنس (ٹوکیو) میں بھارت کی نمائندگی کی۔ وہیں ہندی کوی "اگنے" سے دوستی ہوئی۔ ۱۹۵۸ء بلاری میں منعقدہ ادبی کانفرنس کی صدارت کی۔ ۱۹۵۹ء سنٹرل انسٹیوٹ آف انگلش حیدر آباد کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اپنے عہدہ کا جائزہ لیا۔ اسی سال بلجیم میں منعقدہ بین الاقوامی مشاعرہ میں بھارت کی نمائندگی کی۔ ۱۹۶۰ء دیاوا پرتھوی کو مرکزی ساہتیہ اکادمی نے انعام دیا۔ مشرقی آفریقہ کا دورہ کیا۔ پدم شری ایوارڈ ملا۔ اسی سال کل ہند انگریزی اساتذہ کی کانفرنس کی صدارت کی۔ ۱۹۶۱ء انگلینڈ کا سفر، یوگانڈا (مشرقی آفریقہ) میں منعقدہ کامن ویلتھ کانفرنس میں بحیثیت نائب صدر حصہ لیا۔ ۱۹۶۲ء انگلش کانفرنس میں افتتاحی تقریر کرنے کے لئے کیمبرج کا سفر کیا۔ ۱۹۶۵ء انگلینڈ کا دورہ، کیمبرج میں منعقدہ کامن ویلتھ ممالک کے انگریزی ادب کی تعلیمی کانفرنس میں بھارت کی نمائندگی کی۔ ۱۹۶۶ء جامعہ بنگلور کے وائس چانسلر کی حیثیت سے عہدہ کا جائزہ لیا۔ ۱۹۶۷ء اخبار 'سنویا' شروع کیا۔ کرناٹک یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹوریٹ کی ڈگری عطا کا۔ سمرسوے جیون کو ایک ہی جلد میں شائع کیا۔ ۱۹۷۰ء شملہ انڈین انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانس سٹڈیس کے ادارہ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے عہدہ کا جائزہ لیا۔ کیلیفورنیا پسیفک یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹوریٹ عطا کی۔

۱۹۷۷ء بھارتیہ گنان پیٹھ ایوارڈ کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۸ء مرکزی ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر نامزد۔ ۱۹۸۱ء پٹیرتی ستیہ سائی بابا یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ کرناٹک یونیورسٹی کے اکتیسویں سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ دیا۔ اپنی طویل نظم بھارت سندھو رشمی کا اشاعت ۱۹۸۲ء میں کی۔ ۱۹۸۲ء سال کا بہترین ادب انعام کرناٹک ساہتیہ اکادمی نے بھارت سندھو رشمی کا عطا کیا۔ ۱۹۸۳ء میں اسی کتاب کو مرکزی ساہتیہ اکادمی انعام ملا۔ اسی سال روم کے ایک سیمنار میں شرکت کی جس میں یورپ اور جنوبی ایشیاء سے تقریباً دو ہزار مندوبین نے شرکت کی تھی۔ انڈو گریک فنون لطیفہ کے جشن میں حصہ لینے کے لئے یونان کا سفر کیا۔ ۱۹۸۹ء میں بھارت سندھو رشمی کے لئے راجہ جی انعام، اسی کتاب پر آئی. بی. ایچ. ایجوکیشن ٹرسٹ نے انعام عطا کیا۔ ۱۹۹۱ء میں ممبئی میں وزیر اعظم شری پی وی نرسمہا راؤ کے ہاتھوں بھارت سندھو رشمی کتاب کے لئے گنان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا۔ ۲۸/اپریل ۱۹۹۲ء وفات پائی۔

گوکاک کی شاعری

وی کے گوکاک ایک نامی گرامی شاعر ہیں ان کے یہاں حقیقت اور مجاز کا نادر امتزاج پایا جاتا ہے۔ ملے ناڈو کی سرحدوں پر فطرات نے ان کے جذبات میں ایک لہر سی دوڑادی ہے۔ کنڑا اور انگریزی شاعری کی روحانی روایت نے ان کے فطری ذوق کو پروان چڑھایا۔ مشرق و مغرب میں انہوں نے جو سفر کئے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ان کا قیام اور مختلف قسم کے لوگوں سے وسیع تعلقات ان سب نے ان کے دائرہ فکر و نظر کو وسعت بخشی اور تجربات کی نعمت عطا کی ہے۔ آروبندو کے فلسفے نے ان کے فکر کے حق میں بنیاد کا حق ادا کیا ہے۔ اشتراکی نظریات کے مطالعے نے ان کے سماجی احساس کو بلند تر کیا ہے۔ انہوں نے کنڑا شاعری میں دو نئی راہیں کھولیں ہیں اور

صورت و معنی دونوں میں انوکھے تجربے کئے ہیں۔ ان کے پندرہ سے زیادہ مجموعوں میں ہمیں غنائیہ منظومات، طویل نظمیں اور منظوم ڈرامے ملتے ہیں۔ جو سب کے سب بلند درجہ ہیں۔ ان کی غنائیہ نظموں میں ایک حوصلہ مند اور جاذب شخصیت کی کیفیتیں اور افکار ملتے ہیں۔ ان میں بڑے موثر الفاظ میں خدا سے تسلیم و رضا کا پرجوش بیان کیا گیا ہے۔ شیلے کے مزاج کی خواب زدگی اس شاعر کی وضع قطع کا گویا ایک حصہ ہے۔ لیکن یہ قابل ذکر ہے کہ وہ کسی انتہا کی طرف جھکنے نہیں پاتا اور وہ تمام سروں کو اپنے نغموں میں جمع کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس کا پس منظر ہندوستانی ہے اور وہ اپنے سادھن کا پابند ہے۔

جہاز پر انگلستان کا سفر کرتے ہوئے انہوں نے روبرو ہو کر سمندر کی کیفیتوں اور حالتوں کا مشاہدہ کیا اور اس سے متاثر ہو کر اپنے سمندری گیت لکھے "سمندر گیتے گلو" سمندر کا بیان قدیم کلاسیکی شاعری اور کتابوں میں بھی ہوا ہے لیکن آپ نے جو بیان کیا ہے وہ اس سے مختلف اور جدا گانہ ہے یہ نظمیں آزاد نظم کی صنف میں لکھی گئی ہیں اور یہ کنڑ شاعری کو آپ کی انمول دین ہے۔ اس مجموعے میں نوکا یتر جیسی جو نظمیں شامل ہیں انہوں نے شاعر کی فکر کی نئی سمتوں اور نئے سماجی احساس کا مظاہرہ کیا ہے۔ ابھیودیا اور کویا کو یتے گلو میں ان کو اور زیادہ زور اور جوش حاصل ہوا ہے۔ موخر الذکر نظم سے گوکاک کی جدت پسندی شاعری کا آغاز ہوا اور کنڑا شاعری میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوا۔

دیاوا پر تھوی اور بال دے گلاڈی ان کی دو نئی تخلیقات ہیں۔ پہلے میں دو طویل نظمیں ہیں۔ ایک میں زمین سے بادلوں کا نظارہ کیا گیا ہے اور دوسری میں ہوائی جہاز سے زمین کا منظر دکھایا گیا ہے۔ تصورات کی قدر و قیمت اور مشاہدے کی گہرائی نے نظم کی تاثیر میں شدت پیدا کر دی ہے۔ دوسری نظم میں ہمیں کرداری تصویروں کا ایک وسیع و عریض مرقع نظر آتا ہے جسے جدید زندگی

کے پس منظر کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ کرداروں کو معبد حیات میں پر ستاروں کی حیثیت سے سامنے لایا گیا ہے۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ وناٹیکا میں تخلیقی پیداوار شاعری کے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے قیمتی ضرور ہے لیکن اظہار اور ادائیگی کے تجربے کے مقابلے میں ناکافی ہے ان کے اسلوب میں ایک طرح کا ابہام اور ناہمواری موجود ہے لیکن یہ کہتے ہوئے فقروں اور قافیوں کی خوبی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ تجربے اور اظہار کا اتحاد ان کی بہترین تخلیقات میں قابل داد ہے۔

سفر نامہ

کنڑ ادب میں سفر ناموں نے اہمیت تو حاصل کی لیکن ان کو اتنی وسعت حاصل نہیں ہوئی۔ پہلا بیرونی ممالک کا سفر نامہ گوکاک کے خطوط پر مشتمل تھا جو سمدر آچے اِند کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں صرف تعریف ہی نہیں تھی بلکہ اس کتاب نے انگریزوں کی زندگی اور تہذیب کے مشاہدے کے لئے ایک کھڑکی کھولی اور ان کی خوبیاں اور خامیاں دونوں بتلائیں۔

تصانیف

شری گوکاک نے ذولسانی خدمات انجام دی ہیں۔ کنڑا اور انگریزی زبانوں پر انہیں ید طولی حاصل تھا۔ ان کا تصنیفی سرمایہ دونوں زبانوں میں ۶۳ کتابوں پر منحصر ہے وہ شاعر نقاد اور ڈراما نگار تھے اس کے علاوہ تعلیم وثقافت پر بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔ تصانیف (کنڑا) شاعری ۲۳۔ طویل نظم ا (دو جلدوں میں) ڈراما ۴ سفر نامے۔ مضامین وغیرہ ۵۔ ناول ۳ اور تنقید ۱۴۔ تصانیف (انگریزی) شاعری ۳۔ ناول ا۔ تعلیم وثقافت ا۔

ماخذ: ڈاکٹر وِ کرگوکاک، از ملے پورم جی وینکٹیش، ناشر: کنڑا ساہتیہ اکادمی بنگلور

ڈاکٹر شیورام کارنت

ಡಾ॥ ಶಿವರಾಮ ಕಾರಂತ

پیدائش ۱۹۰۲ء   وفات ۱۹۹۷ء

۱۹۰۲ء میں آپ کی پیدائش جنوبی کنڑا ضلع کے کوٹہ میں ہوئی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے آپ جدوجہد آزادی میں حصہ لینے لگے۔ شیورام کارنت کو ادب، مصوری، ڈراما، فلم، تحقیق، سائنس اور سفر نامہ جیسے فنون لطیفہ وادب پر عبور حاصل تھا۔ جنوبی کنڑا ضلع میں یکشاگانا کافی مشہور ہے۔ اس کو سارے عالم میں مشہور کرنے میں شیورام کارنت نے کافی محنت کی اور آج یہ عالمی شہرت یافتہ تفریحی ذریعہ ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعہ سے کنڑا ادب کے طول وعرض کو کافی پھیلا دیا ہے۔ گنڈارلیتا، چومناڈوڈی، بیٹد تورے، مِیٹد جیوا، کُدیرکوس، مَرلی مَن گے، اوداڑید اُڑلِل وغیرہ ان کے چند اہم ناول ہیں۔ بال پرپنچ، اوبھت جگت، وِگنان پرپنچ، جیسے کنڑا رسائل، کنڑا سائنسی ادب کے لئے اہم دین ہیں۔ یکشاگانا بیلا ٹا کے لئے مرکزی ساہتیہ اکادمی نے انعام عطا کیا۔ موکجی یا کنتگل ناول کے لئے گنان پیٹھ ایوارڈ ۱۹۷۸ء میں دیا گیا۔ مَی من گل سلنلتی ناول کے لئے دادا بھائی نوروجی ایوارڈ۔ کیا مبل سارک کا طلائی تمغہ وغیرہ ان کی ہمہ جہتی شخصیت کو انعامات

سے نوازتے ہیں۔ اعزازات لا تعداد۔ شیورام کارنت کی ہستی ایک طرف چلتی پھرتی انسائکلوپیڈیا ہے تو دوسری طرف وہ ساحلی بھارگوا کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۹۹۷ء میں انتقال کیا۔

ناول نگاری

کنڑا ناول نگاروں میں کارنت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے پچیس سے زیادہ چھوٹے بڑے ناولوں میں انہوں نے سماجی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ انہیں باتوں کے بارے میں لکھتے ہیں جو وہ قریب سے دیکھتے ہیں اور جن کو وہ خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے گویا یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ اپنے ذاتی تجربے ہی کو تحریر میں لائیں گے تجربہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اس سرزمین کی کافی سیاحت کی اور خصوصاً جنوبی کنارے کے گوشے گوشے کی سیر کی ہے جہاں وہ پیدا ہوئے اور پرورش پائی وہ بڑے تجربے کے مالک تھے اور زندگی کے مسائل پر غور و فکر سے کام لیا ان کی شخصیت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ شدید قسم کی حقیقت پرست تھے۔ اگرچہ تصور پسندی کو بھی اپنایا تھا مگر اپنے طور پر ان کی حقیقت پسندی ان کی اس پر خلوص خواہش پر مبنی تھی کہ زندگی کا مطالعہ اس کی موجودہ حالت میں کیا جائے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ آئندہ اس کی تعمیر میں کیا اور کتنی دشواریاں پیش آئیں گی۔ ایک حیثیت سے ان کے سارے ناول علاقائی ہیں۔ ان کے کردار اور قصے سب اسی علاقے میں گھومتے ہیں جس سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے اپنے چند ناولوں کو جیسے مَرلی منگے، بٹد اجیوا اور گڑیرا کو سو کو بنیادی طور پر علاقائی بنایا۔ مرلی منگے ان سب میں سب سے بڑا ناول ہے جس میں ساحلی علاقے کے ایک خاندان کی تین نسلوں کے واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ پرل بک کے مشہور ناول دی گڈ ارتھ کی نقل نہیں ہے اگرچہ ان دونوں میں کچھ واقعات کی مماثلت ضرور ملتی ہے۔ گھریلو

زندگی میں گزشتہ سو سال کی مدت میں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں اور ان کے نتیجے میں کیا کیا مسائل پیدا ہوتے گئے ہیں۔ ناول نگار نے اپنے پختہ اور ماہرانہ فن سے کام لے کر ان سب کی اس ناول میں بڑی صاف اور واضح تصویریں پیش کی ہیں۔ علاقائی پس منظر نے سمندر کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کی مدد سے اس میں بڑا دلکش مقامی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ فطرت کا معنی خیز بیان، موضوع کی وسیع وضاحت، ضبط و احتیاط، کردار کا صحیح مطالعہ اور مقامی زبان کا مناسب استعمال ان سب خوبیوں نے مل کر مَرلی منگے کو ایک عظیم ناول بنا دیا ہے۔ اس ناول کی وسعتوں میں ہمیں خواتین اداکاروں کی قابل تعریف توضیحی کردار نگاری سے بڑی حیرت ہوتی ہے جیسے پاروتی، سرسوتی اور ناگ وینی ہندوستانی عورتوں کی اذیت کشی ذاتی قربانی، اور صبر و ضبط کے مجسمے بن کر سامنے آتے ہیں۔ بٹد جیوا ایک اور کامیاب علاقائی ناول ہے۔ مَرلی منگے سے ضخامت میں کم ہے اس میں پلاٹ، کردار اور مناظر کو بڑی خوبی کے ساتھ باہم مربوط بنایا گیا ہے۔

گڑیرا کو سو ضخامت اوسط درجے کی ہے مگر عظمت میں مَرلی منگے کی برابری کرتا ہے۔ اس ناول میں کارنت نے، ملکو دیارو (ملک دیار) قبیلے کی قبائلی زندگی کے حالات ان کے سماجی اور مذہبی رسوم و عادات اور ان کی شکاری کیفیات بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں اور اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔

انہوں نے اپنے دوسرے ناولوں میں بھی متعدد سیاسی اور سماجی مسائل پر بحث کی ہے۔ شاید ان کی ناول نگاری میں سب سے زیادہ دردناک تصویر ان کے ناول چومن دوڈی، میں نظر آتی ہے جس میں ایک اچھوت کا پردرد و غم قصہ بیان کیا گیا ہے جو لاکھ کوشش کرتا ہے پھر بھی زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے تک کو اپنی ملکیت بنانے میں ناکام ہو کر راہی ملک عدم ہو جاتا ہے۔ دوسرے ناولوں میں بیوگی، زناکاری، ازدواجی زندگی میں ناہمواری سیاسی دورنگی، خود غرضی اور

ایک سکول ٹیچر کی بدحالی وغیرہ موضوعات کو استعمال کیا ہے۔ ابتدائی درجوں میں کارنت کا فن روایت طنز آمیز اور نصیحت آمیز رہا۔ لیکن بتدریج بے غرض اور غیر جانبدار ہو گیا۔ اس میں تجربات کی کثرت کا سرمایہ ایک مصور کا اور اک تفصیل اور ایک حقیقت پسندانہ اور عقلیت آمیز شعور موجود ہے۔ کارنت کو اس فن میں مہارت حاصل ہے کہ مشاہدۂ حیات کا اظہار اس طرح کریں کہ وہ خود کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں۔ بعض اوقات وہ ایک شدید حالت سے بڑی عجلت سے گزر جاتے ہیں اور یقین نہیں دلا سکتے۔ بہر طور وہ بڑے ناول نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جن پر فقط کنڑ ادب ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھی فخر کر سکتا ہے۔

ڈراما نگاری

کارنت ایک قد آور ناول نگار ہیں اس کے ساتھ ساتھ ڈراما کے میدان میں بھی تجربات کئے اور کنڑا اسٹیج کی بھی اپنے طور پر خدمت کی۔ ان کے دو طویل ڈرامے ہیں لیکن یک بابی ڈراموں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ ان کے تجربات ان کے چھوٹے ڈراموں میں ہی کامیاب ہوئے ہیں۔ منظوم ڈرامے اور اوپرا ان کی خصوصی دین ہیں۔ ان کو انہوں نے کامیاب بھی بنایا اور مقبول بھی۔

ماخذ: محکمہ اطلاعات ونشریات، حکومت کرناٹک

ڈاکٹر یو۔ آر۔ اننت مورتی
ಡಾ॥ ಯು.ಆರ್. ಅನಂತಮೂರ್ತಿ

پیدائش ۱۹۳۲ء تخلیق و منطقی ادب کے لئے ڈاکٹر یو۔ آر۔ اننت مورتی کافی مشہور ہیں۔ ان کی پیدائش میلگے شیموگہ ضلع میں ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ دوروا س پور کے سنسکرت سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور میسور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جامعہ میسور سے انگریزی ادب میں یم اے کی ڈگری حاصل کی اور جامعہ میسور میں ہی انگریزی ادب کے لکچرر کی حیثیت سے ملازمت میں داخل ہوئے۔ پھر ترقی کر کے کیرلا کے کوٹائم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے صدر مرکزی ساہتیہ اکادمی کے صدر بنے اس طرح آپ نے ریاستی سطح سے ترقی کرتے کرتے ملکی سطح پر مقبولیت حاصل کی۔

جدت پسند افسانہ نگاری

جدت پسند شاعری کے دوش بدوش جدت پسند افسانہ بھی ظہور پذیر ہوا اور آگے بڑھا پہلے اس رجحان کے صرف چند پیشوا تھے جن میں یو آر اننت مورتی بھی ایک ہیں۔ لیکن آگے

چل کر اس مسلک کے فنکاروں کی تعداد بڑھ گئی اور بڑھتی جارہی ہے۔ یو آر اننت مورتی کے افسانوں کے مجموعے، افسانہ جو کبھی ختم نہ ہوگا میں جو افسانہ 'ٹملیا ہنگاز لو' نامی افسانہ ہے وہ جدت پسند افسانے کا بہترین نمونہ ہے۔ اس افسانے میں مضمون بہت موزوں ہے اس میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ وہ انجام پر قاری کو پوری طرح اپنے قابو میں لے لیتا ہے۔ لیکن افسانے کے ڈھانچے میں جو انگریزی حوالے موجود ہیں وہ ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔

یند ینڈ منگیڈ گھے، پرشنے، موٹی، آکاش مت بیکو کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ ان کا پہلا ناول سنسکارا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر قبول عام حاصل کر چکا ہے۔ بھارتی پور، او تھے، بھو ان کے دیگر ناول ہیں۔ سمکشا، سقوشیا، پرگتے مت پر لیسر، لورو ایز فکری تخلیقات ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں انہوں نے کنڑا کو چھٹواں گنان پیٹھ ایوارڈ دلوایا، جس سے گنان پیٹھ ایوارڈ کی عزت افزائی ہوئی۔

ماخذ: محکمہ اطلاعات و نشریات حکومت کرناٹک

ڈاکٹر گریش کارناڈ

ಡಾ॥ ಗಿರೀಶ್ ಕಾರ್ನಾಡ್

پیدائش ۱۹/ مئی ۱۹۳۸ء

گریش کارناڈ کی پیدائش ۱۹/ مئی ۱۹۳۸ء کو ماتھیران (مہاراشٹر) میں ہوئی۔ والد ڈاکٹر رگھوناتھ کارناڈ اور والدہ کرشنا بائی تھے۔ والد ترقی پسند خیالات کے حامل اور سماجی مصلح تھے۔ والدہ پیشہ سے نرس تھیں۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی، بال ودھوا تھیں۔ ڈاکٹر رگھوناتھ کارناڈ کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ سماج کی مخالفت کے باوجود دونوں نے ایک دوسرے کی پسند سے شادی رچائی ان کی چار اولاد ہوئیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ پریما، وسنتا، گریش اور لینا۔ رگھوناتھ کارناڈ گریش کارناڈ سے بھی قد میں لمبے تھے۔ قد کے مطابق عمر بھی درازپائی۔ نوکری کے دوران جتنی مبلغ تنخواہ سے حاصل کی تھی اس سے کہیں زیادہ وظیفہ حاصل کرنے کے بعد پنشن لی۔ گریش کی والدہ جو "آئی" کے نام سے ہر جگہ متعارف ہیں، ترقی پسند خیالات کی حامل اتنی زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں لیکن کسی معاملہ میں اچھے اور برے کا فیصلہ خود کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ بڑی بہن

شادی کے بعد ملائیشیا میں رہتی ہیں۔ بڑے بھائی وسنتا ممبئی میں سنگیت کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور چھوٹی بہن شادی کے بعد ولایت میں رہتی ہیں۔ گریش نے سکنڈری کی تعلیم سرسی کی ماری کامبابائی سکول میں حاصل کی۔ پھر وہ دھارواڑ چلے آئے باسل مشن ہائی سکول سے ایس ایس سی ختم کیا۔ کرناٹک کالج میں ایک ہونہار طالب علم کی حیثیت سے نصابی وغیر نصابی تعلیم میں امتیاز حاصل کرتے رہے۔ اسی طرح بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایم اے کورس کے لئے ممبئی چلے آئے۔ روڈس(Rhodes) سکالرشپ کے لئے عرضی دی، سکالرشپ کے ملنے پر آکسفورڈ میاگڈلین کالج میں بی اے ڈگری میں داخلہ لیا۔ اختیاری مضامین معاشیات (Economics) ریاضیات (Mathematics) اور شماریات (Statistics) اہم تھے۔ ابھی ایک سال کا عرصہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ آکسفورڈ یونین سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں ہندوستانیوں کے لئے یہ عہدہ بڑا ہی مایہ ناز تصور کیا جاتا تھا۔ اس عہدہ پر رادھاکرشنن، جواہر لال نہرو وغیرہ فائز رہ چکے تھے۔ دورانِ تعلیم انہوں نے یوروپی ممالک کا دورہ کرکے ادب کے مختلف اصناف کا تعارف حاصل کیا۔

انگلینڈ جانے سے قبل وہ اپنا ڈرامہ 'یایاتی' جی بی جوشی کو سونپ کر ان سے نظر ثانی کی گزارش کر چکے تھے۔ اس ڈرامے کو جی بی اور کیرتی نے پڑھا اور شائع کرنے کا وعدہ کیا۔ ڈرامہ کے بارے میں انہوں نے یہ رائے دی تھی کہ یہ ڈرامہ کنڑ ادب میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ کیرتی ناتھ کرت کوٹی نے اس پر نظر ثانی و تصحیح کرکے گریش کارناڈ کو انگلینڈ بھیجا تاکہ ان کی رائے اور خیالات معلوم کر سکیں۔ اپنا ڈرامہ 'منوہر گرنتھ مالے' میں شائع ہونا ان کے لئے بڑے فخر کی بات تھی۔ جیسے ہی یہ ڈراما کیرتی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تو ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ انگلینڈ میں بھی اس کی کافی شہرت ہوئی اور بحث مباحثہ بھی ہوا ہر جگہ اس کو پسند کیا گیا۔ اسی وقت

گریش کے من میں یہ ارادہ ہوا کہ اپنی تخلیقات کو غیروں کی زبان میں لکھ کر اوروں کی زبان سے تعریف سننے کے بجائے کیوں نہ اسے وہ اپنی زبان میں پہلے تخلیق کریں اور اپنے لوگوں سے اس کی داد حاصل کریں۔ اسی وقت ٹنڈ ڈبنڈ واری (گزرارات) تاریخی مضامین میں کیرتی کے حوالے سے کسی بات کی تحریک پر کارناڈ نے تاریخی ڈرامہ 'تغلق' کا باب شروع کیا۔ انگلینڈ سے لوٹنے سے قبل تغلق کا مسودہ تیار تھا۔

انگلینڈ میں ان کی تعلیم ختم ہونے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی پریس والوں نے ان کا انٹرویو لے کر انہیں بھارت میں اپنے شعبۂ اشاعت کے منتظم کی حیثیت سے چن لیا۔ دو ماہ کی تربیت دی پھر ایک مہینہ کی تربیت ممبئی میں دی گئی پھر انہیں مدراس بھیج دیا گیا۔ وہاں انہوں نے سات سال تک ملازمت کی۔ اسی دوران مدراس کے ثقافتی پروگراموں میں حصہ لیتے رہے۔ انگریزی ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کرتے رہے۔ اسی دوران 'تغلق' کی تصحیح کے بعد اسے اشاعت کے قابل بنایا۔ پٹا بھیرام ریڈی کے تعلقات سے یو آر اننت مورتی کا ناول 'سنسکارا' کو فلمانے کا دلیرانہ قدم اُٹھایا۔ فلم میں خود انہوں نے پرانیشچار کا اہم رول بھی ادا کیا۔ جس پر اس فلم کو بہترین ایوارڈ حاصل ہوا۔ عوام میں اور ادبی حلقوں میں یہ عام رائے بنی کہ گریش کارناڈ کچھ بھی کرتے ہیں تو اس میں ایک نیا پن ہوتا ہے۔ یہ تعریفی کلمات ان کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے اہم ثابت ہوئے۔ انہوں نے جس چیز کو بھی چھوا سونا بن گیا۔ لیکن اس کے پس منظر میں ان کی جو محنت لگن اور اسٹیج کی تعلیم کام کرتی ہے اس کا کسی کو علم نہیں۔ ایک ڈرامے کی تخلیق ہو یا کسی فلم کو ہدایت دینی ہو یا کہیں تقریر کرنی ہو تو ان کی تیاری دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طالب علم امتحان کی تیاری میں مصروف ہے۔ یہی تو وہ راز ہے جو ان کی کتاب میں ایک نیا پن ملتا ہے۔

سات برس کے قیام مدراس کے دوران وہ ملازمت اور دوسرے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف تو رکھا لیکن اندرونی طور پر اس سے وہ خوش نہیں تھے۔ کنڑا کے لئے کچھ کرنے کا ولولہ ان میں جاگتا رہا انہیں یہ خیال ستانے لگا کہ اگر میں زیادہ دنوں تک مدراس میں ہی رہ جاؤں تو ممکن ہے میں اپنی زبان کنڑا بھی بھول جاؤں گا۔ کئی مرتبہ نوکری سے مستعفی ہو کر دھارواڑ چلے آنے کا ارادہ بھی کیا۔ اسی دوران بھابھا سکالر شپ 88 کے بارے میں علم ہوا تو اس کے لئے عرضی دی۔ اس سکالر شپ کے لئے کارناڈ جیسے ہونہار طالب علم کے علاوہ اور کس پر نظر انتخاب پڑ سکتی تھی۔ انہوں نے جب یہ سکالر شپ حاصل کی تو وعدہ کیا کہ اپنی پسند کی تعلیم حاصل کر کے آخر میں اس پر ایک کتاب بھی لکھ کر دوں گا۔ اس وعدہ پر انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کو الوداع کہا۔ کافی دنوں کی آرزو بر آئی۔ وہ دھارواڑ چلے آئے۔ پہلے سال میں عوامی ادب کا گہرا مطالعہ کیا، کنڑا زبان پر عبور حاصل کر کے ڈرامہ ہیودَنل کا مسودہ تیار کیا۔ دوسرے سال میں ولایت جا کر وہاں کے ڈرامائی تجربوں میں حصہ لے کر آخر میں 'ہیودَن' ناٹک مکمل کیا۔ اس ڈرامہ کو پھر ہندوستانی زبانوں میں سب سے بہترین ڈرامہ قرار دیا گیا اور کملادیوی چٹوپادھیائے ایوارڈ دیا گیا۔ بی وی کارنت کے معاون کی حیثیت سے ایس ایل بھیرپا کی ناول 'ومش ورکشا' کو فلمایا۔ دوران قیام دھارواڑ ایک ثقافتی انجمن دھارواڑ کلا کیندرا کی تاسیس عمل میں لائی۔ اس انجمن نے بہترین ڈرامے، رقص اور موسیقی کے پروگرام دیے۔ کارناڈ نے اپنی دوستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کل ہند سطح کے فن کاروں کو دھارواڑ مدعو کیا اور وہاں کے شہریوں کو ان سے متعارف کرایا۔

سکالر شپ مدت ختم ہونے پر پونا کی F.T.I.I (فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹیٹیوٹ آف انڈیا) کے سربراہ کی حیثیت سے کارناڈ کا تقرر ہوا۔ تین سال کے عرصے میں اپنے انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس کو ازسرنو حیات بخشی۔ موجودہ حالات کے پیش نظر ان میں تبدیلیاں لائیں۔

طلباء و معلمین کے درمیان بہترین رشتوں کو استوار کیا۔ ایک نئی فضا قائم کی، طلبہ آج بھی انہیں یاد کرتے ہیں اور ان کی خدمات کو سراہتے ہیں۔ پونا کے قیام کے دوران انہوں نے اپنے ذاتی کام کاج کے لئے دفتر کی کار کا استعمال نہیں کیا۔ اپنے ذاتی کام کاج کے لئے آٹو رکشا کا استعمال کیا کرتے۔ اس طرح وہ پونا کے آٹو ڈرائیوروں کے ساتھ تعلقات قائم کئے۔ آج بھی وہ ان سے پیار کرتے ہیں انہیں چاہتے ہیں۔

ملازمت کرتے کرتے انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ زندگی کی مشکلات کیا ہیں۔ ایک طرف فن ہے اور دوسری طرف اپنی زندگی، ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا مشکل کام تھا۔ انہیں کے کہنے کے مطابق "ہم لوگ متوسط طبقے سے متعلق ہیں۔ فن سے زیادہ اپنے وجود اپنی ہستی کی حفاظت پر زیادہ توجہ ایک فطری امر ہے۔ اس طرح اپنے فن اور زندگی کے درمیان کسی ایک کا انتخاب مشکل امر بن گیا۔ اسی تذبذب کے عین موقع پر انہیں ہندی سینما میں ایک اہم رول ملا۔ اس اداکاری کے صلہ میں حاصل ہونے والا محنتانہ ایک سال کی آمدنی کے برابر تھا۔ اس کے حاصل ہوتے ہی انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔ اور فلمی دنیا میں چھلانگ لگائی۔ فلمی دنیا کو ایسے باصلاحیت اور تعلیم یافتہ ہوشیار اور ہونہار فنکار کا ملنا مشکل تھا۔ ان کی آمد کی وجہ سے فلمی دنیا میں ایک نئی رونق آ گئی۔ اداکاری سے انہوں نے اپنی زندگی سنواری۔ فلم کی ہدایت کاری ہو یا ڈرامانگاری جس نے انہیں پیسہ نہیں دیا لیکن دل کو ایک تشفی بخشی۔ فلمی دنیا کے تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے وہ ممبئی سے انگلینڈ امریکہ وغیرہ ممالک میں منعقدہ سمناروں میں شریک ہوئے اور اپنی ذہانت سے جو کچھ سیکھا تھا اس کا ازسرنو اعادہ کرتے رہے۔ ان میں علم حاصل کرنے کی لگن، علم کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس موجود ہے۔ مطالعہ کا شوق ہے اور بہت کچھ سیکھنے کا شوق تا حین وحیات قائم رہے گا۔

اب تک وہ شہرت کی سیڑھیاں چڑھ چکے تھے۔ عوام انہیں ایک بہترین ڈرامانگار، فلمی دنیا کے عظیم اداکار اور ہدایت کار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اتنا سب کچھ زندگی میں حاصل کرنے کے باوجود اپنے کنوارے پن کے باعث افواہوں کا شکار بھی ہوئے۔ مشہور اداکاراؤں کے ساتھ ان کی شادی کی افواہیں بھی پھیلیں لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آخر کار ان کی ایک اچھی دوست جس سے سالوں پرانا دوستی کا رشتہ قائم تھا امریکہ کی مقیم برسر روزگار ڈاکٹر سرسوتی گنپتی کے ساتھ ممبئی میں آریہ سماج کے طرز پر ایک سیدھی سادی تقریب میں شادی کرلی۔

شادی کے بعد ڈاکٹر سرسوتی نے امریکہ کو خیر باد کہا۔ گریش کے ساتھ ہندوستان میں اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا۔ رادھا (شالملی) اور رگھو کے جنم سے ان کے گلشن حیات میں رونق آئی اور اب دونوں بتدریج بارھویں اور دسویں کلاس میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ ڈاکٹر سرسوتی کے بارے میں ایک بات کہنا ضروری ہے کہ وہ امریکہ کے ایک بہت بڑے اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے کام کررہی تھیں اپنے پیشہ کو چھوڑ کر بھارت چلی آئیں اور ایک گھریلو خاتون کی حیثیت سے اپنے کنبہ کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔ بچوں کی پرورش میں لگ گئیں۔ ان کی یہ قربانی ان کے کنبہ سے پیار کو ظاہر کرتا ہے۔ اب بھی وہ سماجی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ اور گھر کی ساری ذمہ داری نبھا رہی ہیں جس کے باعث گریش کارناڈ کو یکسوئی کے ساتھ تخلیقی کارگزاریوں میں منہمک رہنے کا موقع ملا۔

ممبئی شہر نے گریش کارناڈ کو زندگی چلانے کے لئے مدد تو کی لیکن ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع نہیں دیا۔ وہاں کی مشینی زندگی کے ساتھ نبھانا مشکل تھا۔ ان کا کافی وقت ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے نکل جاتا ہے۔ بچوں کو کسی اچھی سکول میں داخلہ دلانے کے لئے ان کی پیدائش سے قبل ہی سکولوں میں اندراج ضروری تھا۔ یہ وہ سارے وجوہات تھے جس کے باعث

انہیں ممبئی چھوڑنا پڑا۔ اپنے قیام کے لئے انہوں نے بنگلور کا انتخاب اس لئے کیا کہ یہ دھارواڑ اور مدراس کے درمیان واقع ہے۔ گریش کی والدہ دھارواڑ میں رہتی ہیں تو سرسوتی کی والدہ مدراس میں۔ جہاں تک ہوسکے دونوں سے قریب رہنے کے لئے اور بچوں کی تعلیم کے لئے وہ بنگلور آگئے۔ یہاں انہوں نے کسی بھی ادبی حلقہ سے ناطہ نہ جوڑ کر 'آزاد رہ کر سب سے ملاسب سے جدا' والی کہاوت پر عمل کیا۔ سماجی تبدیلاں، ماحولیاتی احساس کی کئی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بنگلور میں مقیم ہونے کے بعد ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے بہت سے مواقع انہیں فراہم ہوئے اور ہورہے ہیں۔

اس درمیان انہوں نے 'ناگ منڈل'، 'تلے دنڈا' اور 'اگنی مت ملے' ڈرامے تخلیق کئے۔ امریکہ کے گتھری تھیٹرس والوں نے ڈراما 'ناگ منڈل' کا انتخاب کیا اور اس کی ہدایت کاری کے لئے گریش کارناڈ کو مدعو کیا گیا۔ انہوں نے کامیاب تجربے سے گزر کر بہترین ڈرامہ پیش کیا جس کی کامیابی پر نہ صرف ہندوستانیوں کو خصوصی طور پر کنڑیگاؤں کو فخر ہے (یہ بات واضح رہے کہ آج تک گتھری تھیٹرس والوں نے کسی بھی باحیات ڈرامانگاروں کے ڈرامے کو اسٹیج کے لئے انتخاب نہیں کیا) 'ناگ منڈل' کی کامیابی کے مدنظر انہوں نے ان کے لئے ایک ڈرامہ لکھنے کی دعوت دی۔ کارناڈ کے دماغ میں کئی سالوں سے لوکیرتی کی کہانی کا انتخاب کرکے 'اگنی مت ملے' ڈرامہ پہلے کنڑا میں لکھا پھر خود انہوں نے اس کا ترجمہ (The Fire and the Rain) گتھری تھیٹرس کو دیا۔ اس درمیان بسونّ، بجّل، کے دور کی تاریخی شرن تحریک کا مطالعہ کرکے ڈرامہ لکھا۔ یہ ڈرامہ د. را. بیندرے کو لکھنا تھا لیکن نامکمل ہونے کے باعث اس کا نام 'تلے دنڈا' رکھا گیا۔ گہرا مطالعہ اور تحقیق کا نتیجہ کہ ڈرامہ میں جذباتی ٹھیس پہنچنے کا موقع فراہم نہیں ہوتا۔ بہر حال گریش کارناڈ نے آٹھ ڈرامے تخلیق کئے ان میں پرانک کہانیوں پر مبنی ڈرامے

'یایاتی'، 'ہیئن تنج' اور 'اگنی مت سلے' ہیں۔ تاریخی پس منظر کے ڈرامے 'تغلق' اور 'تلے' 'ونڈا'۔ عوامی کہانیوں پر مبنی 'ہیووَدن' اور 'ناگ منڈل'۔ سماجی پس منظر کا ڈرامہ 'انج ملگے' ہے۔ ان کے علاوہ حال میں مہیش ئیل کنچوار کا واسانس جیر نانی 'مرہٹی ڈرامہ کا کنڑ امیں ترجمہ کیا۔

ٹیپو سلطان کے بارے میں ایک ڈرامہ لکھ کر تجربے کے لئے دیا گیا ہے۔ 'آل ڈمیلے' کہانی لکھی۔ گریش کارناڈ اپنی ادبی زندگی کا آغاز نظموں سے کیا (بہت سے لوگ اسی بات سے ا علم ہیں) اس وقت ان کی سب سے بڑی خواہش شاعر کہلوانے کی تھی۔ انہیں کے تخلیق کردہ گیت 'ہیووَدن' اور ناگ منڈل' ڈراموں میں موجود ہیں۔

کارناڈ کے پہلے ڈرامے 'یایاتی' کو کنڑا ساہتیہ اکادمی کا انعام اسی وقت حاصل ہوا تھا۔ عام طور پر ان کی ہر کتاب پر کوئی نہ کوئی انعام حاصل ہوا ہے۔ 'تغلق' کو ریاستی حکومت کا انعام 'ہیووَدن' کو کملا دیوی چٹوپادھیائے انعام، 'تلے ونڈا' کو مرکزی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، ان کی اداکاری کے لئے 'سمسکارا' فلم کے لئے 'سورن کمل انعام'، 'کاڈو' فلم کے لئے سورن کمل انعام 'وندا نوندا کال ڈل' فلم کے لئے 'راشٹر پرشستی' وغیرہ۔ بیندرے کی دستاویزی فلم ان کا ایک اور کارنامہ ہے۔ ذاتی طور پر انہیں پدم شری پھر پدم بھوشن ڈھونڈتے چلے آئے۔ کرناٹک یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری عطا کی اور اب 10 رجنوری 1999ء کو بھارت کا گنیان پیٹھ ایوارڈ برائے 1999ء انہیں حاصل ہوا۔

اس اعلان کے وقت گریش کارناڈ تیرتھ ہلی کے قریب میگروّلی میں دوردرشن کے لئے کوویمپو کے ناول 'کانور ہیگڈتی' کے ایپیسوڈ کو فلمانے میں مصروف تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ کنڑا کو حاصل ہونے والا پہلا گنیان پیٹھ ایوارڈ کوویمپو کو ملا۔ ان کی ناول کو فلماتے وقت ملناڈ کی گود میں کام کرتے وقت کارناڈ کو اس انعام کی اطلاع ملی تو وہ خوشی سے جھوم اُٹھے۔

(بشکریہ کرم ویر، 21۔2۔1999ء، مضمون نگار ڈاکٹر سہاکانت جوشی)

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

ರಘುಪತಿ ಸಹಾಯೆ ಫಿರಾಖ್ ಗೋರಖ್‌ಪೂರಿ

فراقؔ کی پیدائش ۲۸ راگست ۱۸۹۶ء بارہ بجے دن کو بروز جمعہ گورکھپور شہر میں ہوئی۔ ان کے والد جناب گورکھ پرساد بذات خود اچھے شاعر تھے اور عبرتؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا شمار شہر کے ممتاز وکلاء میں ہوا کرتا تھا ان کا آبائی وطن بنوار پار تحصیل بانس گاؤں ضلع گورکھپور تھا۔ بنوار پار بھی فراقؔ کے ایک بزرگ بنواری لال کے نام سے موسوم ہے۔ فراقؔ کے مورث اعلیٰ شیر شاہ کے زمانے میں کہیں سے آکر یہیں آباد ہوئے۔ جب سے یہ خاندان یہیں سکونت پذیر ہوا۔ فراقؔ کے بزرگوں نے جو اس زمانے کے بڑے زمینداروں میں سے تھے پانچ گاؤں بسائے۔ اب بھی اس گاؤں کے رہنے "پنچ گاواں کے کائستھ" کہلاتے ہیں۔

فراقؔ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ان کے والد جناب عبرتؔ نے جو خود بھی اُردو اور فارسی کے عالم تھے، فراقؔ کو اُردو اور فارسی کا درس دیا۔ فراقؔ کے پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحرؔ بھی ان کو اُردو شاعری سے روشناس کراتے رہے۔ ہندی کی تعلیم بھی انہوں نے اسکول میں داخلہ لینے سے قبل ہی حاصل کرلی تھی۔ ۹ سال کی عمر میں ان کا داخلہ ماڈل اسکول گورکھپور میں ہوا۔ مگر دوسرے ہی سال

انہیں مشن سکول میں داخل کر دیا گیا۔ جس کا شمار اس وقت کے ابتدائی تعلیم کی بہترین درس گاہوں میں ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کا داخلہ جبلی سکول گورکھپور میں ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے یہیں سے سکول لیونگ سرٹی فیکٹ سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور ایف اے کرنے کے لئے میموریل سنٹرل کالج الہ آباد چلے گئے۔ ۲۹؍ جون کو ان کی شادی کشوری دیوی سے ہوئی جو بقول فراق یہ شادی ان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھی۔ جس نے ان کی زندگی کو عذاب بنادیا۔ ان نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے ۱۹۱۵ء میں ایف اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ لیکن اس کے بعد انہیں ایک سال کے لئے اپنی پڑھائی ترک کر دینی پڑی کیونکہ انہیں سنگرینی (نیند نہ آنے کا) مرض لاحق ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے الہ باد یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس امتحان میں فراق کی پوزیشن پورے صوبے میں چوتھی تھی۔ ذاکر صاحب نے بھی اسی سال بی اے کا امتحان پاس کیا تھا اور ان کی پوزیشن پورے صوبے میں تیسری تھی (سفر تمام ہوا شکیل ہوا، شکیل احمد، خبر نامہ (ضمیمہ) اتر پردیش اردو اکادمی، ص ۱۷-۱۸)۔ ۱۷؍ جون ۱۹۱۸ء کو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ خاندان بھر کے لئے روٹیاں کمانے والا دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ کچھ دنوں بعد انگریزی سرکار کی طرف سے ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ خاندان کی ڈوبتی ناؤ کے لئے یہ ایک بہت بڑا سہارا تھا۔ لیکن ان کے دل میں ہائے ہائے مچی ہوئی تھی۔ تیس ہزار روپے کے خاندانی قرض کی ادائگی کے لئے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کو جستہ جستہ فروخت کرنے کا انتظام کیا۔ اور ذہنی اور دلی کرب اور ازدواجی زندگی کی بیزارگی کی وجہ سے I.C.S & P.C.S دونوں عہدوں سے استعفیٰ دے کر گاندھی جی کی رہبری میں جنگ آزادی میں شریک ہو گئے۔ اس دکھ بھرے زمانے میں دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے شاعری شروع کر دی۔

پرنس آف ویلس ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کا دورہ کرنے آئے۔ گاندھی جی قیادت میں اس دورے کا ملک بھر میں بائیکاٹ کر دیا گیا، کانگریس کے تمام لیڈر گرفتار کر لئے گئے یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔ یہ واقعہ ۶؍ دسمبر ۱۹۲۰ء کا ہے۔ ۱۳؍ دسمبر ۱۹۲۰ء کو جیل ہی میں ایک فرضی سی کارروائی کے بعد

فیصلہ سنایا گیا۔ آدھے لوگوں کو ڈیڑھ برس کی قید سخت اور سو روپے جرمانے کی سزا ملی اور بقیہ آدھے لوگوں کو جس میں فراق بھی شامل تھے قید محض اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ملی۔ فراق اور ان کے ساتھ ۱۴؍ دسمبر ۱۹۲۰ء کو تیسرے پہر آگرہ جیل پہنچ گئے۔ تقریباً ایک برس کے بعد فراق اور ان کے ساتھیوں کو لکھنؤ جیل منتقل کر دیا گیا۔ لیکن دو ماہ میں ہندوستان بھر کے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ جیل سے چھوٹ کر جب وہ گھر لوٹ آئے تو گھر کی مالی حالت بہت نازک تھی۔ اسی زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو گورکھپور آئے وہاں کے مہمان ہوئے انہوں نے انہیں اپنے دکھ درد نہیں بتائے۔ لیکن سیاست عالم کے قیافہ شناس جواہر لال نے بے کچھ کہے سنے سب کچھ سمجھ لیا اور فوراً فراق کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے الہ آباد کا دفتر کا کاروبار سنبھال لو (میری زندگی کے دھوپ چھاؤں، فراق گورکھپوری (ایضاً) ص ۲۵)۔ جواہر لال کے کہنے پر فراق گورکھپور چھوڑ کر الہ آباد چلے آئے اور ڈھائی سو روپے مہینے پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مستقل سکریٹری بن گئے۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۲۷ء میں جواہر لال نہرو دو سال کے لئے سیاست عالم کا مطالعہ کرنے کے لئے یوروپ چلے گئے۔ پنڈت جی کے چلے جانے کے بعد فراق کے لئے اس عہدے میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اسی لئے انہوں نے پہلے کرسچین کالج لکھنؤ اور بعد میں سناتن دھرم کالج کانپور میں بہ حیثیت انگریزی استاد کے کام کرنا منظور کر لیا۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں فرسٹ ڈویژن میں یم اے حاصل کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے، جہاں سے ۳۱؍ دسمبر ۱۹۵۸ء کو وہ سبکدوش ہوئے۔ وظیفہ یابی کے بعد فراق کو U.G.C کا NATIONAL RESEARCH PROFESSOR مقرر کیا گیا۔ بحیثیت ریسرچ پروفیسر فراق ۱۹۶۶ء تک کام کرتے رہے۔ انہیں علمی اعزازی عہدوں سے نوازا۔ مگر آخر دم تک زبان و ادب کی خدمت کو ہی سب سے بڑا اعزاز سمجھا۔ اور آخر یہ عہد ساز شاعر ۳؍ مارچ ۱۹۸۲ء کو دنیا کی بندشوں سے آزاد ہو گیا۔ (سفر تمام ہوا شکیل ہوا، شکیل احمد، ایضاً صفحہ ۱۹)

فراق کی شاعری

فراق نے جب شروع کی تو امیر مینائی داغ کا بول بالا تھا،وہ بھی امیر مینائی سے متاثر ہوئے، مگر جب انہوں نے اردو شاعروں کو پڑھا تو ان کے طرز میں تبدیلی آئی اور ان کا ایک طرز بن گیا جو اپنے آپ میں خصوصیتیں اور جدت رکھتی ہے۔ فراق جذباتی مزاج کے ہیں مگر اپنے خیالات میں مستحکم ہیں اس لئے وہ اپنے خیالات نئے طریقے سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کی ناہمواریوں اور داخلی کشمکش کے جزبات مجتمع ہو جاتے ہیں ان کی آواز میں انکسار کے ساتھ سنجیدہ مسئلوں کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ ابتداء میں ان کی زبان فارسی آمیز تھی مگر بعد میں وہ ہندی الفاظ کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کرنے لگے۔ فراق نے بیشتر غزلیں کہی ہیں، لیکن نظموں اور رباعیوں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ نثر میں بھی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، مگر خاص طور پر انہیں غزلوں ہی کے باعث عظمت حاصل ہے، کیونکہ ان کے ذہن کی جودت طبع، جذبات کی نرم کسک اور بیان کی انفرادی قوت اپنے پورے عرفان جمال کے ساتھ مجسم ہوا ٹھتی ہے۔ ان کے کچھ شعری مجموعے ہیں۔ (۱) نغمہ ساز،(۲) غزلستان،(۳) شعرستان،(۴) شبنمستان،(۵) روح کائنات،(۶) گل نغمہ،(۷) دھرتی کی کروٹ،(۸) گل بانگ۔ آخری مجموعے میں تقریباً بھی نمائندہ تخلیقیں شامل ہیں۔ فراق کے مجموعوں میں سے کچھ ناگری خط میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ نموتاً کچھ شعر:

شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

دل دکھ کے رہ گیا یہ الگ بات ہے، مگر
ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہوگئے

کب اپنے ہوش میں شب غم کا ثبات ہے
اے درد ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

تھر تھری سی ہے آسمانوں میں
زور کتنا ہے ناتوانوں میں

رفتہ رفتہ عشق مانوس جہاں ہونے لگا
خود کو تیرے عشق میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہوگئی ہے

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدوار ہوں میں کل موت بھی نظر آئی

(اردو کی تنقیدی تاریخ، پروفیسر احتشام حسین، ص۲۶۹)

"فراق کو اس صدی کے موجود پچاس سال کے منفرد اور ممتاز غزل گویوں کی صف اول میں جگہ مل چکی ہے اور یہ امتیاز معمولی نہیں ہے۔ غزل کی آئندہ ساخت و پرداخت اور سمت ورفتار میں فراق کا بڑا اہم حصہ ہوگا۔"(رشید احمد صدیقی)

"فراق اپنی درد بھری داستان کو نرم، دھیمی، شیریں آواز میں بیان کرتے ہیں۔ درد کی شدت میں بھی وہ اپنی آواز پر قابو رکھتے ہیں اور اسے بلند آہنگ نہیں ہونے دیتے"۔ (پروفیسر کلیم الدین احمد)

"فراق کی غزل گوئی میں اس معنی میں ان کے عاشقانہ تجربوں یا فکری میلانات کی ترجمان نہیں ہے جسے عرف عام میں واردات قلبیہ یا 'امور ذہنیہ' کا اظہار کہا جائے گا۔ اس میں وہ ریاض نفس بھی شامل ہے جو علم اور وقوف کی دین ہے۔ اس طرح ان کی شاعری ایک ماورائے شخصیت عنصر کی حامل بن جاتی ہے۔"(پروفیسر احتشام حسین)

"فراق کی شاعری میں ہندوستانی اور آفاقی کلچر اس طرح شیر و شکر ہو گئے ہیں اور ہندوستان کا مزاج اور اس کی ارضیت کچھ اس طرح سماگئی ہیں کہ غزل کی دوشیز گی نکھر آئی ہے وہ انتہاؤں کا ایک سلسلہ بن گئی ہے اور اس کی سادگی اور پرکاری اور ہشیاری میں کوئی حد فاصل باقی نہیں رہی"۔ (پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

تنقید:

نئی تنقید خاص طور پر مارکسی تنقید کا آغاز ہندوستان کی نئی سماجی اور معاشی بیداری کے ساتھ

اس وقت ہوا جب ترقی پسند مصنفین نے اپنی انجمن کی تاسیس کی۔ یہ وہ وقت تھا جب عوام کے سیاسی شعور نے جمہوری اشتراکیت پر مبنی آزادی کا مطالبہ کیا۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبد العلیم، فیض، سبط حسن، سردار جعفری، ممتاز حسین وغیرہ نے مارکسی فلسفے کی بنیاد پر ادب اور زندگی کے رشتے کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ تنقید کا یہ سائنسی نقطۂ نظر اتنا وسیع بن گیا کہ کچھ ایسے مصنف جو پہلے فلسفۂ جمالیات کی بنیاد پر تخلیق ادب کی باتیں کیا کرتے تھے، تنقید کے نام پر اپنے داخلی احساسات کو پیش کرتے تھے، اس نئی طرز تنقید کی طرف چلے آئے۔ ان میں فراق گورکھپوری قابل ذکر ہیں۔

فراق جس طرح شاعری میں رومانیت میں ڈوبی ہوئی غزلوں کا گھیرا توڑ کر زندگی کے نئے شعور کی طرف بڑھے، اسی طرح تنقید میں انہوں نے سماجی پس منظر کو اہمیت دینا شروع کیا۔ مگر یہ بات صاف طور پر دکھائی پڑتی ہے کہ وہ تنقید میں مارکسی نقطۂ نظر کو مکمل طریقے سے اپنا نہ سکے۔ ان کا انداز فکر نیا ہوتے ہوئے بھی فلسفۂ جمالیات کے نیچے دبا رہا۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے 'انداز ے اور حاشئے' شائع ہو چکے ہیں اور دو کتابیں اُردو کی عشقیہ شاعری اور اُردو غزل گوئی بھی چھپ چکی ہیں۔ ان کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور ادب میں ایک طرح کا جذباتی اور تعمیری رشتہ چاہتے ہیں۔ لیکن مارکس وادیوں کی طرح اس انسان کے معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا عکس ثابت کرنے کو شش نہیں کرتے۔ دراصل ان کا رجحان تاثریت اور جمالیات کی طرف ہے جس کے لئے وہ سماجی پس منظر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ (اردو کی تنقیدی تاریخ، پروفیسر احتشام حسین، ص ۲۰-۲۱)

قرۃ العین حیدر

ಖುರ್ರತುಲ್ ಐನ್ ಹೈದರ್

قرۃ العین حیدر (ولادت ۱۹۲۷ء) اُردو کی ممتاز اور منفرد قلم کار ہیں۔ آپ کے والد سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر سجاد حیدر بھی اپنے زمانے کے مشہور افسانہ نگار تھے۔ قرۃ العین حیدر نے ۱۹۴۷ء میں انگریزی ادب میں یم اے کیا اور مزید تعلیم کے لئے لندن چلی گئیں، جہاں وہ معروف اخبار ٹیلی گراف کے شعبۂ ادارت اور بی بی سی سے بھی وابستہ رہیں۔ وطن واپسی کے بعد وہ کئی سال بمبئی کے انگریزی رسالہ "امپرنٹ" اور "السٹریٹڈ ویکلی" سے متعلق رہیں۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں وزیٹنگ پروفیسر کی ذمہ داریاں نبھائیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مجموعہ "ستاروں سے آگے" سنہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا جو جدید افسانہ کا نقطۂ آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، کار جہاں دراز ہے، آخر شب کے ہم سفر، گردش رنگ چمن، چائے کا باغ، سیتا ہرن اور چاندنی بیگم ان کے ناول ہیں جن میں "آگ کا دریا" کو اپنے وسیع ترین کینوس، بے مثال کرداری نگاری، اچھوتی تکنیک، صحت مند نظریہ

حیات اور دلکش طرزِ بیان کے لئے جدید کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ناولٹ اور تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا کینواس بے حد وسیع ہوتا ہے جس میں برصغیر کی تاریخ اور تہذیب کا پس منظر ہوتا ہے۔ (اردو کی تنقیدی تاریخ، پروفیسر احتشام حسین، ص۳۳۶)

قرۃ العین حیدر سنہ ۱۹۴۷ء تک خیالی رومانی قصے لکھتی رہیں۔ مگر آزادی کے بعد کی صورت حال سے متاثر ہو کر جب انہوں نے اپنا پہلا ناول 'میرے صنم خانے' لکھا تو ان کا نقطۂ نظر اور صناعی دونوں بدلے ہوئے نظر آئے۔ اسی وقت سے انہوں نے ناول اور افسانے میں بے مثال ترقی کی ہے۔ انہوں نے مغربی ادب، ہندوستانی فن ثقافت کا گہرا مطالعہ کیا اور زبان کے استعمال پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ ان کی مقبولیت کا راز بھی ہندوستان کے زندگی کے دھاروں کی تلاش ہی ہے۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر اور پت جھڑ کی آواز ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں تخلیقی استعداد کی ایک خصوصیت نظر آتی ہے۔ انہوں نے کئی اچھے ترجمے کئے ہیں۔ (قرۃ العین کی منتخب کہانیاں، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا)۔

ممتاز ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر کو دہلی اردو اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، جو کل ہند سطح پر ادب کی مجموعی خدمات کے لئے دیا جاتا ہے۔ ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے، شال، ترافی اور سند پر مشتمل ہے، محترمہ کو دیا گیا۔ (ہماری زبان، ۸۔ ۱۴ر اپریل ۲۰۰۱ء)

علی سردار جعفری

ಅಲಿ ಸರ್ದಾರ್ ಜಾಫ್ರಿ

سوانحی خاکہ

علی سردار جعفری کی پیدائش بلرام پور ضلع گونڈا، اترپردیش، ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ موجودہ دور کی کثیر الجہات شخصیت، ذی فہم ادیب، صاحب نظر نقاد، بالغ نظر مفکر، انسان دوست، امن کا شیدائی، اشتراکیت کا علم بردار، صحافت و خطابت کا مرد میداں اور میڈیا کا جانکار، شعلہ نوا حد درجہ اہم انقلابی شاعر تھے۔ علی سردار جعفری کی شاعری کے کس بل کی نشان دہی بچپن ہی سے ہو رہی تھی۔ دو سال کی عمر میں توتلی زبان میں تک بندی کرنے لگے تھے۔ بچپن ہی سے حدیث خوانی اور اہل بیت کی شان میں قصیدہ سرائی شروع کر دی تھی۔ کسی نے بچپن میں ایک بار ان کا نام پوچھا تو انہیں نے جواب دیا۔

نورِ نظر احمد مختار ہوں میں — لختِ جگر حیدر کرار ہوں میں
ہے فتح و ظفر قوت بازو سردار — یعنی پسر جعفر طیار ہوں میں

(۱) احمد مختار چھوٹے چچا کا نام، (۲) حیدر کرار منجھلے چچا کا نام، (۳) ظفر عباس بھائی کا نام، (۴) جعفر

طیار والد کا نام۔(ڈاکٹر شیمہ رضوی "قطرے سے گہر ہونے تک" ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۲۸)

علی سردار جعفری کا گھریلو ماحول مذہبی تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احمدیہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کی فراغت کے بعد بڑے ہی مؤثر انداز میں تقریر اور نوحہ خوانی کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان کے والدین انہیں مولوی بنانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے روایتی قسم کے نام نہاد مولوی بننے سے احتراز کیا۔ وہ سلطان المدارس لکھنؤ سے تین بار بھاگے اور مغرب کی جدید تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ ملک کے نامور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ باغیانہ ذہن کی وجہ سے ان کی تعلیم اور مشق سخن کی رغبت نے انہیں علم وادب کے میدان میں ممتاز مقام عطا کیا۔ انہوں نے مطالعے کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا۔ ان کی زندگی کے ماحصل کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ بظاہر انہوں نے مولوی بننے سے گریز کیا تھا مگر صحیح معنوں میں وہ زندگی بھر مولوی رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے مدرسہ موضوع کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ ان کی نگاہ میں پوری دنیا مدرسہ ثابت ہوئی۔ اصلاح معاشرہ، اخوت و محبت اور احترام آدم ان کا نصب العین تھا۔ ان کے نزدیک ظلم بدعت تھی۔ انہوں نے حسین ابن علی کی قربانی اور ایثار کو اپنا شعار بنایا تھا۔ کہیں منشائے والدین مشیت ایزدی تو نہیں ہوا کرتی۔(ڈاکٹر غلام حسین، لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۴)

مجاہد آزادی:۔

۱۹۳۶ء میں علی گڑھ کی تعلیم کے دوران برٹش گورنمنٹ کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں تقریر کرنے کے جرم میں کالج سے نکال دئے گئے۔ یہ گویا ان کا پہلا احتجاجی قدم تھا۔ "تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے جعفری صاحب کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا اور پھر اسی یونیورسٹی نے انہیں 'ڈی لٹ' کی ڈگری سے نوازا۔ دہلی یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔(سردار جعفری کچھ

یادیں، کچھ باتیں پروفیسر خورشید نعمانی ردودلوی ہماری زبان سردار جعفری نمبر، ص ۱۲) ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے دوان تعلیم باغیانہ جرأت مندی پر پہلی بار جیل ہوئی اور پھر لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل، بنارس سنٹرل جیل، آرتھر روڈ جیل بمبئی، ناسک سنٹرل جیل کی زندگانی کے لمحات نے ان کی متاع لوح قلم کو جلا بخشی۔(ڈاکٹر شیمہ رضوی قطرے سے گہرے ہونے تک' ہماری زبان سردار جعفری نمبر، ص ۲۸)۔

انہوں نے مارکسی نصب العین کو اپنا لیا تھا، اور تخلیقی ادب میں اسی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اظہار کے تین وسیلے ہیں۔ اول: طبقاتی کش مکش کے طور پر مزدور اور محنت کش طبقے کا ذکر۔ دو: نظام کہنہ کے خاتمے کے لئے انقلاب اور بغاوت کا ذکر۔ سوم: عورت کے بجائے عروس وطن سے التفات اور اس کا خصوصی ذکر۔(ڈاکٹر شیمہ رضوی قطرے سے گہر ہونے تک' ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۲۸)۔

سردار جعفری کی شاعری

شروع میں انہوں نے کچھ رومانی نظمیں لکھیں۔ لیکن اب ان کا شعور سماجی اور سیاسی مسئلوں کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے اس شعور کا ارتقا قومی اور بین الاقوامی شعور کے ساتھ رہا اور اس کا ایک اچھا آئینہ بھی ہے۔ انسان دوستی ان کی شاعری میں پھٹی پڑتی ہے۔ ناانصافی اور ظلم کے خلاف جعفری کے الفاظ اور جملے "آتش فشاں" کے مانند پھٹے پڑتے ہیں۔ ان کا طبقاتی شعور ان کی نظموں میں سچا زور بھر دیتا ہے۔

سردار جعفری نے اپنی زندگی میں جو ادبی سفر کیا اور اس کی یادگاریں چھوڑیں وہ اس طرح ہیں۔ "پرواز" (شاعری کا پہلا مجموعہ) ۱۹۴۳ء۔ "کس کا خون ہے" (شعری مجموعہ)۔ "نئی دنیا کو سلام" (طویل تمثیلی نظم) ۱۹۴۸ء۔ جو شہنشاہیت مخالف جذبات سے معمور ہے اور آزاد وزن کے استعمال کا

ایک بہت عمدہ نمونہ مانی جاتی ہے۔ نظم کا یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا، بھارت کی تقریباً گیارہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ "خون کی لکیر" (نظمیں) ۱۹۴۹ء۔ "امن کا ستارہ" (طویل نظم) ۱۹۵۰ء۔ "لہو پکارتا ہے" (نظمیں) ۱۹۷۸ء۔ ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، جیل میں لکھی گئی تھیں اس کی زبان آسان اور بحر چھوٹی ہے۔ نظم اپنے دور کے زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان کی روحانی گھٹن، تنہائی اور ویرانی کا اظہار کرتی ہے۔ اس میں جعفری نے کامیاب داخلی مصوری بھی کی ہے۔ شاعری آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی نئے انقلاب کے خوابوں میں الجھا رہتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی نظم کامیاب ہے۔

چیتوں کی پلکوں پر　　　اوس جگ مگاتی ہے
املیوں کے پیروں پر　　　دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے　　　مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے میں　　　چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں　　　پھر بھی ایک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر　　　دودھ جذب ہو جائے

'شادی کا دن' اور 'جیل کی رات' سردار جعفری کی دو مختصر نظمیں ہیں جو فنی اعتبار سے بھی مکمل اور موثر ہیں۔ ان میں ایک سے ایک اچھوتی اور تشبیہات اور استعارات استعمال ہوئی ہیں۔ آزاد نظم کے فارم میں لکھی گئی ہیں اور جیل کے اندر لکھی گئی ہیں۔ جیل کی ایک رات کا بند اس طرح ہے۔

پہاڑ سی رات
اداس تارے تھکے مسافر
گھنا اندھیرا سیاہ جنگل
جہاں سلاخیں اگی ہوئی ہیں
اذیتوں کے پرانے عفریت قیدیوں کو نگل

۔۔۔۔۔۔ رہے ہیں
خوشی تھمی ہوئی کھڑی ہے
علی سردار جعفری اور عوامی ادب (ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۱۰)

"ایک خواب اور" یہ شعری مجموعہ بھی ہے اور ایک نظم کا عنوان بھی۔ یہ آزادی ملنے کے بعد لکھی گئی۔ جو کتنے حسین خوابوں کی بھیانک تعبیر تھی۔ وطن کے حصے بکھر گئے اور ملک میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ اور رنگ اور گلال کے بجائے انسانی خون سے ہولی کھیلی گئی جس کے خلاف فیضؔ، مخدومؔ، جوشؔ بہت سے شعراء نے رد عمل ظاہر کیا ہے۔ سردار جعفری نے بھی رد عمل ظاہر کیا اور آخر میں دعوت دی ایک اور خواب دیکھنے کی۔

پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اس ہمت دشوار پسند

سردار کی یہ نظم تشبیہات اور استعارات سے مملو ہے۔
ان کی آزاد نظم کا ایک نمونہ دیا جاتا ہے۔

جاگ ہندوستان اپنے خواب گراں سے
دیکھ آزادی کی صبح کا نور پھیلا ہوا ہے
تیرے برسوں کے بچھڑے ہوئے لال گھر آرہے ہیں
یہ غلامی کی زنجیر کو توڑ آئے
قید خانے کے در کھول آئے
اپنی آغوش میں ان کو بڑھ کر اٹھا لے
اپنے دل میں بٹھا لے
یہ ہمالہ ہے، یہ وندھیاچل ہے، یہ نیل گری

یہ تیرے کھیت ہیں تیرے کھلیان ہیں
تیری کانیں ہیں یہ، باغ ہیں تیرے کارخانے
یہ تیرے سبز و شاداب میدان، یہ ہنستی ہوئی وادیاں ہیں
یہ تیری صاف و شفاف بہتی ہوئی ندیاں
تیری گودوں کی پالی ہوئی بیٹیاں ہیں
ان کو اپنے گلے سے لگالے
اپنے پاکیزہ آنچل کے نیچے چھپالے

ہاتھوں کا ترانہ

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو
تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے، انساں کی کہانی ان سے ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
صدیوں سے گزر کر آئے ہیں، یہ نیک و بد کو جانتے ہیں
یہ دوست ہیں سارے عالم کے، پر دشمن کو پہچانتے ہیں
خود شکتی کے اوتار ہیں، یہ کب غیر کی شکتی مانتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ ہاتھ نہ ہوں تو مہمل سب، تحریریں اور تقریریں
یہ ہاتھ نہ ہوں تو بے معنی، انسانوں کی تقدیریں
سب حکمت و دانش علم و ہنر، ان ہاتھوں کی تفسیریں ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
یہ سرحد سرحد جرتے ہیں اور ملکوں ملکوں جاتے ہیں
بانہوں میں بانہیں ڈالتے ہیں اور دل سے دل کو ملاتے ہیں
پھر ظلم و ستم کے پیروں کی زنجیریں بن جاتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
تعمیر تو ان کی فطرت ہے، اک اور نئی تعمیر سہی
اک اور نئی تدبیر سہی، اک اور نئی تقدیر سہی
اک شوخ و حسیں خواب اور شوخ و حسین تعبیر سہی
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کو چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

سردار جعفری اپنے دھن کے پکے تھے۔ شاعری کی دنیا میں لوہا منوا کر رہے۔ انہوں نے زندگی کا رخ بدلا لیکن حالات سے منہ کبھی نہ موڑا۔ بقول جعفری "میں نے صرف پھولوں اور ستاروں، محبوب کے رخساروں اور آنکھوں، چھلکتے ہوئے جاموں اور لرزتے ہوئے پیراہنوں میں حسن نہیں دیکھا ہے۔ بلکہ تیل کے چشموں اور کوئلے کے کانوں اور سوت کے کارخانوں میں بھی حسن کو بکھرا ہوا دیکھا"۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ جعفری کے گھر سے جدید شاعری نے جنم لیا وہ جدید شاعری کے پیکر ہیں۔ نئے نئے الفاظ، نئے نئے تشبیہات اور استعارات اس طرح سے اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں کہ ناقابل فراموش ہیں۔ کوئلہ کو سیاہ ہیرا، چشموں کے تیل کو پگھلتے ہوئے ستارے، روئی کو کپاس کی چاندنی وغیرہ۔ ایسی نئی تصویریں پیش کئے ہیں۔ ادب اور فن کے لئے اگر کوئی قیمتی چیز دنیا میں ہے تو وہ بقول جعفری "میرے لئے زمین سے زیادہ حسین، انسان سے زیادہ پُر وقار اور مستقبل سے زیادہ تابناک کوئی چیز نہیں ہے"۔ بے شک یہ تین چیزیں دنیا میں اپنا اپنا مقام رکھتی ہیں۔

ایک مرتبہ اعظم گڑھ میں شبلی اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا تھا، جس میں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی شریک تھے اس جلسے میں سردار نے اپنی نظم "سرحد" پڑھی تھی، جو بہت پسند کی گئی، خاص کر اس کا آخری بند جس میں انہوں نے سرحد کو مانگ سے تعبیر کیا ہے کافی پسند کی گئی۔ (ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص۱۰)

ان کے علاوہ شاعری کا ایک مجموعہ "سرحد" بھی ہے۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی جب فروری ۱۹۹۹ء میں بس سے لاہور (پاکستان) گئے تھے تو اپنے ساتھ یہ مجموعہ لے گئے تھے۔ انسانیت کی بنیاد پر ہندو پاک دوستی کو فروغ دینے میں سردار جعفری کی شاعری نے اہم رول ادا کیا اور ان کے یہ سب سے بڑا اعزاز تھا کہ دو ملکوں کی سرحد پر جب دنوں ملکوں کے وزیر اعظم امن دوستی اور بھائی چارے کی بات چیت کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے تو سردار کی نظموں نے ان کے درمیان کڑی کا رول ادا کیا اور ان کی نظموں کا مجموعہ "سرحد" غیر معمولی شہرت کا حامل ہوا۔ ان کی نظم "سرحد" اور "گفتگو بند نہ ہو" کا بول بالا رہا۔ یہ سردار جعفری کا ان کی زندگی میں سب سے بڑا اعزاز تھا۔ یہ اعزاز ان کے لئے دلی تسکین کا باعث بنا۔ (اردو کا بے باک شاعر علی سردار جعفری، ڈاکٹر سید معصوم رضا، ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۱۳)

پوری نظم سرحد پر ہونے والے حادثات اور سانحات کے گرد گردش کرتی ہے اور سردار اس

کے محافظ نظر آتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہندو پاک کی ہولناک جنگ کے موقع پر لکھی گئی یہ نظم بڑی معنوی تہ داریت اور تخلیقیت رکھتی ہے گویا ہندوستانی تاریخ اور سرحد کے حوالے سے کشت و خون نفرت و حقارت اور انسانیت سوز جنگ و جدال کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم ماضی کی کوتاہیوں، موجودہ صورت حال اور کشمکش مستقبل کے لائحہ عمل کی بچی تصویر دیکھ سکتے ہیں جو عبرت ناک بھی ہے اور ناقابل فراموش بھی۔

اس سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی اشکوں کی آہوں کی شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں
یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے جھلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی

ان اشعار کی روشنی میں شاعر بظاہر سرحد سے متنفر نظر آتا ہے لیکن دیکھا جائے تو مخصوص اوقات اور تناظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ نظم سرحد کے وجود کے تعلق سے اس ہولناک اور خونریز حادثات کی یاد تازہ کر کے انتباہ بھی کرتا ہے اور اس کے وجود کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کی سعی بھی۔ خون، آہوں اور کراہوں کے درمیان اس کا جنم ہوا اور کشت و خون کے بعد ہی اس کی حد بندی ممکن ہو سکی۔ شاعر سرحد کے اس تاریخی واقعات اور سانحات کو اس لئے بھی یاد کرتا ہے کہ یہ انسانیت کا خون، نفرت کے شعلے اور اجڑے خاندان کی علامت ہے، یادگار ہے اور تاریخ کا اہم باب بھی۔ (سرحد کا محافظ، علی

سردار جعفری، ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۸)

سردار جعفری نے اپنے قلم سے سرحد کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ہندوپاک تنازعہ سے انہیں بڑی تکلیف تھی۔ وہ دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اس خواہش کو اکثر انہوں نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ ”نظم کون دشمن ہے“ کا ایک بند۔

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش

ہم آئیں گے صبح بنارس کی روشنی لے کر

ہمالیہ کو ہواؤں کی تازگی لے کر

اور اس کے بعد یوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

نظم ”گفتگو“ کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ نظم کا یہ بند خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے صبح سے شام ملاقات چلے ہم پہ ہنستی ہوئی تاروں بھری رات چلے

(علی سردار جعفری مرحوم انورالحسن وسطوی۔ ہماری زبان سردار جعفری نمبر، ص ۱۵)

عہد حاضر میں سرحد سے مراد محض حدود ملک نہیں بلکہ افواج کی کثرت، جنگی مشقیں اور توپ وبارود ہے جو انسانی وجود کو کسی لمحہ تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے۔ سرحد پر ہونے والی ہلچل، توپ و تفنگ کا جماؤ، انسانی جسم کے بے ترتیب ٹکڑے اور خون میں لت پت بے گناہ انسان کی لاشوں کی منظر کشی کسی خاص ملک اور خطے تک محدود نہیں بلکہ ارض کے تمام ملکوں کی سرحدوں کی تصویر ہے۔ (ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۸)

ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، مترجم

”ترقی پسند ادب“ (نثر) ۱۹۵۳ء۔ ”لکھنؤ کی پانچ راتیں“ (نثر) ۱۹۶۲ء۔ ”منزل“ (افسانوں کا

مجموعہ)۔ ”پیار“ (ڈرامہ)۔ جعفری نے میرابائی اور کبیر داس کے کلام کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ رام داس اور کالی داس کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ ”پیغمبران سخن“ (کبیر، میر، غالب) ۱۹۷۰ء۔ ”اقبال شناسی“ (نثر) ۱۹۷۷ء۔ انگریزی زبان میں قرۃ العین حیدر کے ساتھ Ghalib and his Poetry ترقی پسند ادب کی نصف صدی، نظام اُردو خطاب (ہماری زبان ۱۵/ اگست ۲۰۰۰ء، ص ۱) نثر میں ایک کتاب اور ہے جس میں اردو شاعری میں استعمال ہوئے الفاظ (استعارہ اور تشبیہ وغیرہ کے طور پر) کو مع مثال اور وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیوان غالب، دیوان میر اور کبیر کی تالیف و ترتیب بھی کی ہے جو ہندی اردو رسم الخط میں ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

بے مثال مقرر

بمبئی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی تاسیس سے اب تک وہ اس شعبہ سے بے پناہ دلچسپی رکھتے تھے۔ سردار جعفری اور مجروح دونوں زندگی کے آخری ایام تک بڑی پابندی سے اس کی میٹنگوں، سمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کرتے۔ جعفری صاحب بہترین مقرر تھے، وہ سمیناروں میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے، ان کا طرز ادا، ان کا دلکشن، ان کی لفظیات، ان کا حافظہ کوئی کہاں سے لائے گا۔ وہ بولتے تو جی چاہتا کہ تقریر کبھی ختم نہ ہو۔ وہ کہیں سنا کرے کوئی

ان کو دیکھنے اور سننے کے بعد یہ خیال کہ۔

کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(ہماری زبان، علی سردار جعفری نمبر، ص ۱۲)۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے انہیں دور حاضر کا ادبی مقرر قرار دیا ہے۔ (ہماری زبان، ۸/ اگست ۲۰۰۰ء ص ۵)۔

صحافی

انہوں نے مجاز، سبط حسن کے تعاون سے ایک رسالہ ”نیا ادب“ نکالا تھا بعد میں وہ بمبئی چلے گئے

جہاں فلمی اور ادبی کاموں میں لگے رہے۔ سردار جعفری ایک اعلیٰ پایہ کے صحافی بھی تھے ان کی وابستگی "نیا زمانہ، نئے ادب اور دوسرے ترقی پسند رسالوں سے تھی۔ وہ ایک رسالہ "گفتگو" سہ ماہی کافی ضخیم نکالتے تھے۔ وہ بڑی سائز میں ایک ادبی مجلہ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے اس کے کئے نمبر بھی نکالے۔ ایک ترقی پسند نمبر بھی نکالا تھا جو اگست ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا جس سے اپنے تحقیقی مقالہ "اردو ناول ۱۹۳۶ء کے بعد" کی تیاری میں مشغول تھے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ (سردار جعفری اور عوامی ادب، ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۲۶)

فلمی دنیا سے وابستگی

سردار جعفری فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔ ان کے قول کے مطابق وہ سرحد پر ٹہلتے رہتے تھے جہاں سے انہیں کوئی فلم والا کھینچ لے جاتا تھا تو وہ اس کے لئے کام کر دیا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کئی فلموں کے لئے کہانیاں لکھیں ہیں اور کئی فلموں کی ہدایت بھی کی ہے۔ انہوں نے "منا، دھرتی کے لال، آسمان، محل، شہر اور سپنا، تکسالات" جیسے فلموں کے نغمے لکھے۔ "شام غم کی قسم" صدا بہار گیت ہے جو آج بھی ہر انسان کی زبان پر ہے۔ اور کئی بعض فلمیں بھی بنائیں جن میں سے "گیارہ ہزار لڑکیاں" تعلیم یافتہ حلقہ میں کافی پسند کی گئی۔ اس میں ترقی پسند نقطۂ نظر سے دور اس دور کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے مسائل پیش کئے گئے تھے۔ ایک زمانے میں اردو کے مشہور ادباء و شعراء (سرسید، جگر مرادآبادی وغیرہ) کی زندگی پر ٹی وی فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ویسے وہ ایسے ہی عوامی، ادبی اور مقصدی فلمیں بنایا کرتے تھے۔ وہ اس طرح اردو شعراء و ادباء سے عوام کو روشناس کرانا چاہتے تھے جو کتابوں میں ان کو نہیں پڑھ سکتے تھے۔

علی سردار جعفری کو اللہ تعالیٰ نے انعامات واکرامات واعزازات سے نوازا۔ اردو سے متعلق کمیٹیوں کے اکثر صدر نشین اور کبھی رکن رکین رہے۔ مثلاً بھارت سرکار نے انہیں ۱۹۹۸ء گیان پیٹھ ایوارڈ نوازا۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، پدم شری کا خطاب، سجاد ظہیر ایوارڈ، فیض احمد فیض، اقبال سمان، اقبال مڈل (پاکستان)

مخدوم ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ اور غالب ایوارڈ وغیرہ۔ حکومت بہار نے بھی ۱۹۹۷ء میں جعفری کو مولانا اسرار الحق انعام سے نوازا تھا، جو ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے، شال اور توصیفی سند پر مشتمل تھا۔ (ہماری زبان، سردار جعفری نمبر، ص ۱۵) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی مجموعی خدمات پر ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ واجپائی صاحب نے گیان پیٹھ ایوارڈ دیتے ہوئے کہا تھا کہ "علی سردار جعفری کو یہ اعزاز دے کر ہم نے اپنی عزت افزائی کی ہے۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ان کی شاعری کا نہایت باریکی سے جائزہ لیا تھا۔ اس کی بڑی تعریف بھی کی ہے۔ "وہ جدو جہد کے شاعر ہیں، امن کے شاعر ہیں، اگرچہ کبھی کبھی جنگ کی تلقین بھی کرتے ہیں، لیکن جنگ امن کے لئے، ظلم کے خاتمے کے لئے، سامراجیت سے لڑنے کے لئے۔ انہوں نے اس رجحان کا پتہ دیا تھا۔ (ماہنامہ نیا دور، جولائی ۱۹۹۹ء) ۱۹۳۲ء میں ممبئی کیا آئے کہ یہیں کے ہو رہ گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۶ برس کی تھی۔ کافی دنوں سے ممبئی اسپتال میں برین کینسر کا علاج جاری رہا، آخر کار یکم اگست ۲۰۰۰ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

علی سردار جعفری نے اپنی ساری زندگی اردو زبان وادب کے گیسوؤں کو سنوارنے میں گزار دی، انہوں نے اردو ادب کو اپنی تحریروں سے مالا مال کیا اور جو کچھ ان کے دل و دماغ میں انسان کی فلاح و بہبود کے منصوبے تھے وہ آخری دم تک اس کے لئے فکر مند رہے۔ ہندو مسلم اتحاد، انسانی مساوات اور اردو کی ترویج و بقا کے لئے انہوں نے رات آنکھوں میں کاٹی۔ اب جا کر انہیں چین ملا۔ ان کی موت پر بلا لحاظ مذہب وملت سبھوں نے خراج عقیدت پیش کر کے ان کی ادبی عظمت کو مسلم اور مستند قرار دیا۔ وفات یکم اگست ۲۰۰۰ء کو ہوئی۔ ہندوستان گیر پیمانے پر جن دانشوروں نے خراج عقیدت پیش کیا ان کی شاعری اور ان کی دانشورانہ عظمت کے لئے کافی ہے۔

©Karnataka Urdu Academy, Bangalore-560 001

KANNADA AUR URDU KE JNANPEETH INAAM YAFTHA AHL-E-QALAM

(a brief introduction of kannada and urdu Jnanpeeth Awardees)

Compiled
By
Prof. MOHAMMED SIBGHATULLA

Pages	:	80
Price	:	Rs. 80
First Edition	:	2001
No. of Copies	:	1000
Printed at	:	Span Print, Bangalore
Published by	:	Hamid A.Safi, Registrar, Karnataka Urdu Academy, 14/3, 3rd Floor, Canara Finance Corporation Complex, N.T.Road, Bangalore-560 001